حیات
خواجہ حافظ قطب الدین احمد

بانی مطبع نامی لکھنؤ

مرتبہ
حکیم خواجہ شمس الدین احمد
میونسپل کمشنر لکھنؤ

من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مؤمن فلنحیینہ حیوۃ طیبۃ

ابو الحسنات حاجی حافظ خواجہ قطب الدین احمد صاحب مرحوم

کی سوانح عمری جسمیں

انکے خاندانی حالات، پاکیزہ زندگی کے واقعات، اور مذہبی، قومی و علمی خدمات کا
مفید و سبق آموز تذکرہ اور قابل تقلید اوصاف و اخلاق و عادات کا بیان ہے

بحکم

جناب مولانا حافظ حکیم خواجہ شمس الدین احمد صاحب و جناب خواجہ قمر الدین احمد صاحب مالکان مطبع نامی لکھنؤ

باہتمام
بانکے لال سکسینہ پرنٹر

نامی پریس لکھنؤ میں طبع ہوئی

مئی ۱۹۳۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والعاقبہ للمتقین، والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف المرسلین سیدنا محمد والہ واصحابہ اجمعین۔

دیباچہ

ابھی صرف دو ہفتہ گذرے کہ والدِ ماجد ابوالحسنات خواجہ حافظ حاجی قطب الدین احمد صاحب نے ۲۶ اپریل ۱۹۳۵ء کو انتقال فرمایا۔ وفورِ غم وہجوم کار وافکار سے اس کا موقع نہ تھا کہ ان کی سوانح عمری مرتب کرنے پر اتنی جلد توجہ کر سکتا، لیکن اعزا اور بزرگوں کے اصرار سے اس کا ارادہ کرنا پڑا، اگرچہ دل ودماغ کی پریشانی سے یہ توقع نہیں ہے کہ میں اس فرض کو بخوبی انجام دے سکونگا۔

والد مرحوم نے ۱۹۲۸ء میں اپنی سوانح عمری خود قلمبند کی تھی اور اس کا نام تذکرۂ عبرۃ الناظرین رکھا تھا، میں اس کو بجنسہ شائع کر دیتا کیونکہ خود نوشت سوانح عمری (آٹو بیوگرفی) اس سوانحعمری (بیوگرفی) سے زیادہ مستند ہے جو دوسرا شخص تحریر کرے لیکن بعض وجوہ سے اسکی اشاعت مناسب نہ معلوم ہوئی، اولاً وہ بہت ناکمل اور غیر مرتب ہے۔ ان کے

بیشمار مذہبی، قومی اور علمی خدمات کا اس میں ذکر نہیں ہے، ثانیاً مرحوم کا
اس کی تحریر سے مقصد صرف اپنی اولاد اور خاندان کے لوگوں کو اپنی پچھلی
زندگی کے حالات وواقعات سے آگاہ کرنا تھا عام اشاعت مقصود نہ تھی، اور
اسی لئے بہت سی باتیں اس میں ایسی ملیں گی جن سے عام لوگون کو دلچسپی
نہ ہوگی ان کی حیات میں میں نے اس کو پڑھ کر ارادہ کیا تھا کہ مین خود ان کی
سوانح عمری لکھ کر شائع کرونگا لیکن افسوس ہے کہ مکروہات زمانہ نے اسکا
موقع نہ دیا، ورنہ اُسوقت لکھتا تو اس سے بہتر اور اس سے زیادہ مکمل لکھ سکتا
شکر ہے کہ ان کی سوانح عمری مرتب کرنے میں مجھے اس وقت بھی دشواریوں
کا سامنا نہیں ہے اول تو ان کی خود نوشت سوانح عمری میرے سامنے موجود
ہے۔ خاندانی حالات میں ان کی ایک دوسری قلمی کتاب محفوظ ہے جس میں
بہت شرح وبسط وتحقیق سے انہوں نے بزرگوں کے واقعات قلمبند کئے ہیں
دوسرے ان کی ہمیشہ یہ عادت رہی کہ وہ ہر تحریر کو اپنے پاس محفوظ رکھتے
تھے اور کسی معمولی سے معمولی رقعہ یا خط یا تحریر کو کبھی ضائع نہ فرماتے تھے،
آج بہت سی الماریوں میں اور متعدد آہنی وچوبی صندوقوں مین سالہا
سال کے رجسٹر، بہی کھاتے، مقدموں کی عدالتی وپنچایتی فیصلے۔ انجمنون
کے رجسٹر، چند دل کی ہزار دل رسیدیں، پرانے پرانے خطوط اور تحریریں
حسابات، کتابیں اور دوسرے قسم کے بیشمار کاغذات نہایت حفاظت و
احتیاط سے رکھے ہوے ملے ہیں، جن کی مدد سے بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے
مرحوم کثیر الاحباب تھے لیکن افسوس ہے کہ اب ان کے ہم سن دوستوں
میں شاذونادر ہی کوئی باقی رہگیا ہے ایک ایک کرکے سب چل بسے، کس سے
ان کے حالات دریافت کروں اور کون بتانے والا ہے۔

والد مرحوم کی سوانح عمری کی ترتیب و اشاعت محض اس خیال پر مبنی نہیں ہے کہ وہ میرے والد تھے اور میں ان کے نام کی شہرت و بقا چاہتا ہوں بلکہ اصل یہ ہے کہ وہ ایک ایسے انسان تھے جن کی زندگی ہمارے اور قوم کے لئے بہترین نمونۂ عمل تھی، وہ اوصاف حسنہ سے بدرجۂ کمال متصف تھے اور خدا پرستی، تقویٰ و صداقت، جوش عمل و محبت اسلامی میں اسلاف کی ایسی یادگار تھے جس کی نظیر اس زمانہ میں ملنا دشوار ہے انہوں نے نہایت کمسنی میں غربت اور یتیمی کے ہاتھوں سخت مصیبتیں برداشت کیں۔ عزیزوں کی بے اعتنائیوں اور دوستوں کی بیوفائیوں نے صدمے پر صدمے پہنچائے۔ گردوپیش جو ہم سن و ہم صحبت تھے وہ اخلاق و زندگی کو بگاڑنے اور خراب کرنے والے تھے، بجز خدا کے دنیا میں کسی کا سہارا نہ تھا جو ان کے کام آتا، باوجود اس کے قدرت نے جو فطرت سلیمہ ان کو ودیعت کی تھی اس نے ہر قدم پر رہنمائی کی، اور ان کو صحیح راستہ پر چلایا اور ترقی کے منازل پر پہونچایا استقلال، ثبات عزم و قوت عمل نے ہر مشکل کو انکے واسطے آسان کر دیا، اور دیانت، راستبازی و صفائی معاملات نے ان کے کاروبار کو کامیاب بنا دیا، ان کو دولت دنیا حاصل ہوئی اور خوب حاصل ہوئی لیکن ایک سچے اور پکے مسلمان کی طرح انہوں نے دنیا سے دل نہیں لگایا۔ دنیا طلبی و زر پرستی کو اپنا مطمح نظر نہیں بنایا، اور دنیا سے دین کی خدمت لی اور اس کو دین کا ہمیشہ محکوم رکھا۔

قوت عمل اس قدر زبردست تھی کہ تمام عمر اپنوں اور غیروں کا کام کرتے رہے، جس پر وقت پڑا اس کے کام آئے اور جس نے مدد چاہی اس کی

مددکو اُٹھ کھڑے ہوئے پھر نہ تحسین کی خواہش نہ شکریہ کی پروا اور نہ نام و نمود کی تمنا، جو نیکی کی خدا کے لئے کی اور لا اسئلکم علیہ اجرا ان اجری الا علی اللہ ان کا مقولہ رہا۔

اگلے زمانہ کے مسلمانون کے جو اوصاف سنے جاتے تھے وہ مرحوم میں آنکھوں سے دیکھ لئے، اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں، زمانہ ان کے دیکھنے کو ہمیشہ ترسے گا مگر وہ نظر نہ آئیں گے اور دنیا ایسے پاکیزہ نفس بزرگوں کو ڈھونڈے گی مگر وہ کہیں دستیاب نہ ہوں گے۔

بہر حال قضا و قدر پر کوئی اختیار نہیں ہے، ہر بشر کو ایک روز مرنا اور دنیا سے سفر کرنا ہے۔ لیکن ایسے برگزیدہ حضرات کی وفات ایک قومی ماتم ہے اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی اور قوم کی موجودہ اور آیندہ نسلوں کو انکی پاکیزہ سیرت اور قابل تقلید کارناموں اور گراں بہا خدمتوں سے باخبر کریں تاکہ ایسے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کا شوق انکے دلوں میں پیدا ہو اور وہ ان پر فخر کر سکیں۔

آخر میں راقم الحروف کی جملہ ناظرین سے استدعا ہے کہ وہ والد مرحوم کے لئے دعائے مغفرت فرمائیں اور اگر ان کے حق میں کوئی فروگذاشت مرحوم سے ہو گئی ہو تو از راہ کرم اس کو معاف فرمائیں۔ اور یہ بھی دعا کریں کہ خداوند کریم اِس ننگ اسلاف کو مرحوم کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے اور صحیح معنوں میں ان کا جانشین کرے۔

شمس الدین احمد

۱۱ر مئی ۱۹۳۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یہاں کہ بہت یاد رہو

باب اوّل

ولادت، خاندان، طفولیت و عنفوان شباب، تعلیم و تربیت ملازمت، مطبع نامی کا جاری کرنا، کاروبار کی ترقی و حادثات صحیفۂ نامی کا اجراء

ولادت بروایت جدۂ مرحومہ ۲۴ رجادی الاول ۱۲۷۰ھ مطابق ۲۳ر فروری ۱۸۵۴ء اوّل پاسِ شب جمعہ کو ولادت ہوئی۔

خاندان خاندانی حالات میں آپ نے ایک مستقل کتاب ۱۳۴۶ھ میں لکھی تھی مختصر بیان یہ ہے کہ قریشی النسب تھے اور ان کے بزرگ عرب سے کشمیر میں آئے تھے، خواجۂ خواجگان نواب ابوالحسن خاں شقدار کشمیر مورث اعلیٰ تھے اور رجلۃ الملک، وزیر الوزراء، نواب خواجہ سعد اللہ خاں بہادر الملقب بہ علّامی و فہامی وزیر اعظم سلطنت مغلیہ اجداد مین تھے یہ سلاطین مغلیہ

سے عہد میں اس خاندان کو کئی پشتوں تک جاہ ومنصب حاصل رہا، پھر زوال
سلطنت کے قریب بعض افراد اس خاندان کے ڈھاکہ چلے گئے، جن میں
اس وقت تک امارت وریاست چلی آتی ہے اور بعض اشخاص لکھنؤ
چلے آئے اور یہاں رہ کر سکونت اختیار کی اور شاہان اودھ کے زمانہ
میں بہت موقّر ومرفہ الحال رہے۔ جن شرفائے کشمیر نے لکھنؤ کو اپنا وطن
بنا لیا تھا ان میں بعض ایسے بھی تھے جو اپنی شرافت، خداداد قابلیت
اور خدمات جلیلہ کی بنا پر اعلیٰ ترین مناصب کے مستحق سمجھے گئے، منجملہ
اُن اصحاب کے خاندان مذکور سے رشتۂ قرابت رکھنے والوں میں نواب
ظہیر الدولہ محمد یحییٰ علی خاں اور نواب شرف الدولہ محمد ابراہیم خاں سلطنت
اودھ کے وزیر اعظم مقرر ہوئے، خواجہ محمد مقیم (والدۂ مرحومہ کے نانا محمد علی شاہ
کے داروغۂ خاص اور ان کے بھائی نواب قمر الدولہ بادشاہ کے
مصاحب تھے،

والد مرحوم کے جد امجد مولوی خواجہ محمد یحییٰ بہت بڑے عالم اور
نہایت متّقی و پابند شریعت تھے، موتی۔ مشک۔ زعفران اور شال کی
تجارت کرتے تھے اور لکھنؤ۔ دہلی اور کلکتہ میں ان کی عظیم الشان تجارتی
کوٹھیاں تھیں آخر عمر میں ترک تجارت کر کے گوشہ نشین ہو گئے اور
عبادت الٰہی میں بسر کی۔ راقم الحروف کے جد امجد ابو البرکات خواجہ
نجم الدین احمد تھے جن کو زہد وتقویٰ کے لحاظ سے لوگ حضرت نجم الدین
کبریٰؒ سے تشبیہ دیا کرتے تھے، عربی وفارسی میں ان کی استعداد بہت
اچھی تھی، اور درسیات میں انکے شاگرد بھی بہت تھے جن میں شیخ محمد رضا
میر ابن حسن اور منشی سالگرام مالک مطبع گلزار اودھ زیادہ مشہور ہوئے

خط نستعلیق کے بہت اچھے ماہر سمجھے جاتے تھے، شاعری کا بھی شوق تھا فدا تخلص کرتے تھے اور بہ روایت جناب خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز مرحوم ان کے کلام فارسی و اردو کے دو مکمل دیوان علحٰدہ علحٰدہ تھے بیدل کے طرز پر صوفیانہ رنگ میں کہتے تھے اور مثالیہ میں صائب کا انداز تھا۔ ایک مثنوی نجم الہدیٰ لکھی تھی جو مثنوی مغربی کے طور کی تھی بیدل کا یہ قطعہ اکثر درو زبان رہتا تھا ؎

جمعے بہ تمنائے زر و مال خوشند ۔۔۔ قومے بہ تماشائے خط و خال خوشند

بیدل ہمہ را بہ حال بدمی بینم ۔۔۔ خوشحال کسانیکہ بہر حال خوشند

نہایت متواضع اور خوش اخلاق تھے اور باوجودیکہ تجارت وکاروبار سے دولت بہت حاصل کی تھی لیکن طبیعت فقیرانہ پائی تھی، اور دنیا سے دلبستگی نہ تھی - ۸ جمادی الاول ۱۲۷۸ھ کو بہ عمر ۳۹ سال وفات فرمائی - وفات سے کچھ پہلے والد مرحوم کو پاس بلا کر چند نصیحتیں کیں جو انہوں نے اپنے تذکرہ میں نقل کی ہیں اور ہم بخوف طوالت ترک کرتے ہیں انکے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جد مرحوم کس پایہ اور مرتبہ کے بزرگ تھے اور دین و دنیا کی فلاح کے لئے کس قدر کام کی باتیں تبلا گئے اور یہ وہی باتیں تھیں جنکو والد مرحوم نے اپنی ساری زندگی کے واسطے دستور العمل بنائے رکھا اور ان کی بدولت فلاح دارین حاصل کی۔

تذکرۂ اسلاف میں والد مرحوم نے لکھا ہے کہ ہمارے خاندان میں خدا کے فضل سے کوئی جاہل نہیں رہا، عورتیں تک پڑھی لکھی ہوتی تھیں خدا پرستی، تقویٰ و دین داری کے ساتھ تبلیغ اسلام و خدمت قوم کا شوق افراد خاندان کے دلوں میں ہمیشہ موجزن رہا۔ اسلاف میں جو

تجارت پیشہ تھے وہ غیر مشروع طریقوں سے بچتے تھے اور جنہوں نے ملازمت کی اور ترقی کرکے وزارت نوابی، معتمدی اور نظامت تک پہونچے انہوں نے کبھی اپنے آقاؤں سے بے وفائی اور نمک حرامی نہیں کی۔ ہمارے خاندان میں کوئی شخص افعال شنیعہ کا مرتکب نہیں ہوا اور لہو ولعب واستعمال مسکرات سے خدا نے سب کو بچایا۔ امراض خبیثہ میں بھی کوئی مبتلا نہیں پایا گیا، نہ کوئی دیوالیہ ہوا اور نہ کسی نے فوجداری کے جرم میں سزا پائی، ہمارے خاندان کے لوگ منہیات شرع سے بہت سختی کے ساتھ بچتے تھے اور فرائض مذہبی کو شدید پابندی کے ساتھ بجالاتے تھے، اور شادی بیاہ سوائے اپنے خاندان کے دوسرے خاندان میں نہ کرتے تھے تاکہ بزرگوں کی نسل محفوظ رہے اور ان کے روایات مفقود نہ ہو جائیں۔

والد مرحوم نے اپنے نسبی وخاندانی حالات نہایت تفصیل اور شرح وبسط سے لکھے ہیں اور بزرگوں کا نام بنام ذکر کیا ہے۔ ہمنے مختصراً کچھ نقل کر دیا ہے، باقی اس خیال سے ترک کرتے ہیں کہ یہ رسالہ بہت طویل ہو جائے گا اور اصل مقصد سے دور پہونچ جائیگا۔

طفولیت وعنفوان شباب

۱۸۵۷ء کے غدر میں والد مرحوم کی عمر تقریباً پانچ یا چھ سال کی تھی، جد مرحوم لکھنؤ میں موجود نہ تھے بلکہ شاہی ملازمت کے سلسلہ میں گونڈہ گئے ہوئے تھے، جب لکھنؤ میں بھگدڑ مچی اور تمام شرفا شہر کو چھوڑ کر قرب وجوار کے گاؤں اور دیہات کی طرف بھاگنے لگے تو جدہ مرحومہ بھی ان کو اور دو خورد سال لڑکیوں کو لے کر اپنے برادر حقیقی مولوی خواجہ محمد اصغر مرحوم اور اپنے رشتہ کے بھائی خواجہ محمد مقیم

(داروغۂ شاہی) اور اپنے حقیقی خالو حافظ حسن جان خلف نواب قمر الدولہ مرحوم کے ساتھ پا پیادہ گھر سے نکل کھڑی ہوئیں اور سب نے کاکوری کا رخ کیا جو لکھنؤ سے قریب ایک قصبہ ہے۔ روسائے کاکوری نے غالباً اس اندیشہ سے کہ قافلہ میں بعض امرائے دولت و متعلقین حکومت اَیا لل ہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کو پناہ دینے سے سرکار کمپنی کے مورد عتاب ہوں۔ قصبہ کے اندر ٹھہرنے کی اجازت نہ دی اور پورا قافلہ تمام شب بے آب و دانہ جنگل میں پڑا رہا صبح کو وہاں سے چل کر قصبۂ موہان کی راہ لی، وہاں کے نیک دل رؤسا نے بطیب خاطر سب کو پناہ دی اور ایک بڑا احاطہ رہنے کے واسطے دیا اور جب تک لکھنؤ میں امن کا اعلان نہ ہوگیا سب وہیں مقیم رہے، جدہ مرحومہ کے پاس کچھ طلائی زیور تھا وہ انہوں نے ۸ر تولہ کے حساب سے فروخت کردیا اور ان کے بھائی نے ایک ہزار روپیہ کا پرامیسری نوٹ سو روپیہ کو بیچ ڈالا اور اسی سے چندے بسر اوقات کرتے رہے۔

انگریزی حکومت کے تسلط کے بعد یہ قافلہ لکھنؤ کو واپس آیا اور جد مرحوم بھی گونڈہ سے آئے تو گھروں کا عجیب نقشہ پایا جو کچھ مال و اسباب و اثاثہ تھا سب لٹ چکا تھا اور کوئی چیز ان میں باقی نہ رہی تھی جدّ مرحوم کی ملازمت بھی شاہی حکومت کے ساتھ ختم ہو چکی تھی، ناچار انگریز حکام سے ملے اور اپنی حالت و مصیبت بیان کی، انہوں نے فرنیچر کی تیاری کا ٹھیکہ دیدیا جس سے کثیر آمدنی کی صورت نکل آئی اور بہت فارغ البالی سے بسر ہونے لگی، افسوس کہ یہ حالت دیرپا نہ رہی اور تھوڑے ہی زمانہ کے بعد ان کا انتقال ہوگیا، اُس وقت والد مرحوم

کی عمر آٹھ سال تھی، کوئی بڑا بزرگ سرپرست نہ تھا اور جو تھے بھی وہ اپنے اپنے مصائب و مشکلات میں مبتلا تھے، جد مرحوم کا سارا کارخانہ درہم و برہم ہوگیا، ہزاروں روپیہ پھیلا ہوا تھا سب ڈوب گیا۔ صرف ایک رستوگی کے پاس دس ہزار روپیہ کی رقم جمع تھی اسنے واپس کرنے سے انکار کر دیا، جس کے جو چیز ہاتھ لگی وہ لے بھاگا، جدۂ مرحومہ کیا کر سکتی تھیں، اب جو کچھ سامان یا اثاثہ گھر میں موجود تھا اسی کو بیچ بیچ کر بسر اوقات کرنے لگیں،

تعلیم | مگر ایسی تنگدستی و عسرت کی حالت میں بھی والد مرحوم کی تعلیم میں انہوں نے کوتاہی نہ کی، قرآن شریف حفظ کرایا، اردو، فارسی و عربی کی تعلیم دلوائی چنانچہ فارسی میں تمام درسی کتابیں ختم کیں، عربی شرح ملا جامی تک پڑھی، خوشنویسی کا فن حاصل کیا، خط نسخ کی اصلاح مولوی ہادی علی مرحوم سے اور نستعلیق کی اصلاح منشی امیر اللہ تسلیم مرحوم سے لیتے رہے اور دونوں میں کامل دستگاہ بہم پہونچائی۔ جدہ مرحومہ کا ارادہ تھا کہ علوم عربیہ کی تکمیل تعلیم دلائیں گی مگر تنگدستی نے ترک تعلیم پر مجبور کر دیا۔

ہم یہاں پر والد مرحوم کے خود نوشت تذکرہ سے چند سطریں بلفظہا نقل کر لیتے ہیں،

"والد مرحوم کی مروّت و محبت میں میرے کسی اُستاد نے مجھ سے تعلیم کا معاوضہ قبول نہیں فرمایا۔ ورنہ جس قدر پڑھا اس سے بھی محروم رہتا۔ پیٹ بھر روٹی کھانے کو میسر نہ تھا اساتذہ کی خدمت کہاں سے کرتا۔ راقم زمان ولادت سے تا ایندم دائم المرض رہا۔ علم مروج زمانہ یعنے انگریزی

پڑھا لکھا نہ تھا۔ کوئی ہنر سوائے بے ہنری نہ جانتا تھا۔ والد مرحوم کا انتقال میرے زمانِ طفلی میں ہو گیا تھا۔ جس نے مجھے دادہالی میراث سے محجوب کر دیا تھا۔ والد مرحوم نے جو ذاتی سرمایہ چھوڑا تھا وہ سب تلف و ضائع ہو گیا تھا جائداد غیر منقولہ میں ایک بالشت زمین میرے قبض و تصرف میں نہ تھی۔ دو ہمشیر ناکتخدا تھیں۔ جن کا عقد کرنا لازمات سے تھا،،

ملازمت

۱۸۸۵ء میں جب کہ والد مرحوم کی عمر تقریباً سترہ سال کی تھی انہوں نے ترک تعلیم کر کے مطبع منشی نولکشور میں کاپی نویسی کی خدمت پر بمشاہرہ پانچ روپیہ ماہوار ملازمت اختیار کی، اور منشی صاحب نے شرح الیاس مع متن و حواشی کتابت کے لئے حوالہ کی جب ایک ماہ گذرا اور خزانچی کے پاس تنخواہ لینے کے لئے گئے تو انہوں نے کہا کہ میاں صاحبزادہ ایک وقت میں تمہارے والد نے ہم سے ۵ روپیہ قرض لئے تھے جو نہ ہم نے مانگے نہ اُن کو دینا یاد رہے، والد مرحوم نے باوجودیکہ پہلے مہینہ کی تنخواہ ہاتھ آئی تھی اور وہی گھر بھر کے رزق کا مستقل سہارا تھی بہ کمال خندہ پیشانی وہ ۵ روپیہ خزانچی صاحب کے آگے رکھدیے کہ آپ والد مرحوم کا قرضہ مجھ سے وصول کر لیجئے میں نہیں چاہتا کہ ان پر اس کا بار رہے۔ منشی صاحب آنجہانی کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی اور انہوں نے آرڈر بک منگا کر بجائے ۵ روپیہ کے معہ ۸ روپیہ ماہوار تنخواہ کر دی، جس میں سے ۳ روپیہ ماہوار ایک شخص نبی بخش کو دیے جاتے تھے کہ وہ ہمراہ جایا کرتا تھا۔ اسی طرح بدفعات تنخواہ میں اضافہ ہوتا رہا اور دو سال

کی مدّت میں ۲۵ عہ ماہوار ہو گئے اور ۲۵ ماہوار ایک خادم کے مقرر ہوئے
منشی صاحب آنجہانی پر والد مرحوم کے حسن خدمات و اظہار لیاقت
کا کچھ ایسا اثر پڑا کہ وہ ان کے حال پر بے حد شفقت و عنایت مبذول
فرمانے لگے، اور ان کو والد مرحوم پر انتہائی بھروسہ اور اعتماد ہو گیا
چنانچہ مطبع کے جملہ کاتبوں اور مصححوں کا جن میں بڑی بڑی قابلیت اور
شہرت کے لوگ تھے ان کو افسر مقرر کر دیا، اور بار بار انسے خوشنودی
کا اظہار کیا کرتے تھے، منشی صاحب آنجہانی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے
دو خط آج تک محفوظ ہیں جن میں سے ایک خط کا خلاصۂ عبارت ذیل
میں نقل کرتا ہوں۔

مولوی خواجہ قطب الدین صاحب۔ آپ نے جو کچھ
مشقت کارخانہ کے کتب کی ترتیب میں اور عمدہ لیاقتی
و مشورہ میں جانکاہی فرمائی ہے اُس کے بابت خاص
شکریہ ادا کرتا ہوں اور میری آرزو ہے کہ ایک طلائی
مڈل آپ کو دوں کارخانہ کے دربار میں یا جو امر آپ کی
مسرّت کا باعث ہو اُس کو ظاہر کروں آپ کی طرف سے
دل کارخانہ کی بھلائی کے خیال میں رہتا ہے اور آپکا
دل پورے شریفوں کا ہے اور اُمید ہے کہ آپ اپنے
شریفانہ طریقہ عمل و برتاؤ سے ہمیشہ بامراد و خوش
رہیں گے،

نولکشور سنہ ۱۸۷۶ء

مقام جے پور

ایک تیسرے خط میں جس کا والد مرحوم نے حوالہ دیا ہے مگر اس کی اصل محفوظ نہیں ہے۔ منشی صاحب نے کوئی کار نمایاں انجام دینے پر انکا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے اور لکھا ہے کہ آپ کی توجہ خاص سے صلہ میں تین تولہ کا ڈھولنا تیار کرانے کے واسطے میں نے کنول خزانچی سے کہدیا ہے وہ تیار کرا کے میری جانب سے آپ کی خدمت میں پیش کرینگے اور آپ رکن مطبع سمجھے اور کہے جانے کے لائق ہیں۔

غرضکہ منشی صاحب جو بے حد مردم شناس، شرفا پرور اور لائق و متدین ملازمین کے نہایت قدر دان تھے والد مرحوم پر اپنی عنایتیں برابر مبذول کرتے اور ان کے اختیارات بڑھاتے رہے، بیسوں قابل قابل اصحاب ان کی ماتحتی میں کام کرتے تھے مگر سب ان کے برتاؤ اور حسن سلوک سے خوش رہتے تھے، اور انہوں نے خود لکھا ہے "کہ اس کمسنی اور ناتجربہ کاری کی حالت میں بظاہر میری ترقی کا سبب یہ تھا کہ میں نے کبھی اپنے آپ کو مطبع کا منصرم یا مہتمم نہیں خیال کیا بلکہ میں سمجھتا تھا کہ مطبع کا اور کارپردازان مطبع کا ادنیٰ خادم ہوں، سب سے جھک کر ملتا تھا، اور معمولی ملازم سے بھی تم سے نہیں بلکہ آپ سے خطاب کرتا تھا، سب سے سلام میں سبقت کرتا خواہ وہ خاکروب یا سقہ ہی کیوں نہ ہو، مطبع کے ہر فائدہ کو اپنا ذاتی فائدہ اور اس کے ہر نقصان کو اپنا ذاتی نقصان تصور کرتا تھا، ہر شخص کی بھلائی چاہتا اور مشکل کے وقت پر کفالت کرتا تھا، لوگوں کو حیرت تھی کہ ایک کمسن لڑکے نے یہ عروج حاصل کرلیا کہ اچھے اچھے قابل اور پرانے ملازمین اس کے ماتحت کردیے گئے، اور وہ خود مختاری

کے ساتھ جس طرح چاہتا ہے انسے کام لیتا ہے"! غرضکہ دس سال اسی طرح گذر گئے، قضائے کار یہ اتفاق پیش آیا کہ ایک مصیبت زدہ شہزادے جن کا نام بیان شکوہ تھا اور مطبع میں بزمرۂ کاتبین ملازم تھے اُن کو ترمزی شریف کتابت کے واسطے دی گئی جب وہ لکھ چکے تو منشی صاحب نے کسی سبب سے ان کی اُجرت روک لی، والد مرحوم ان کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے ان کی اُجرت کے لئے بہت لڑے اور جب کامیابی نہ ہوئی تو ان کے حال پر رحم کھا کے اپنے پاس سے روپیہ دے دیا، اس کے بعد اس معاملہ میں کچھ ایسی پیچیدگیاں پڑیں کہ والد مرحوم نے جو بہت ذکی الحس تھے ملازمت سے استعفا دے دیا اور تھوڑے دنوں کے بعد ڈاکٹر دیدار بخش صاحب اسسٹنٹ سرجن کی سفارش پر سنٹرل جیل میں ملازم ہو گئے، وہاں اُس زمانہ میں ایک مطبع بھی تھا اور قیدیوں کو کام سکھا کر چھپائی کا کام ان سے لیا جاتا تھا والد مرحوم پریس کے کام میں خوب ماہر ہو چکے تھے وہاں بھی افسروں کو اپنے کام سے بہت خوش رکھا اور قیدیوں کے ساتھ ایسا اچھا برتاؤ کیا کہ وہ حلقہ بگوش ہو گئے، جیل میں دو سو قدم کے فاصلہ پر ایک مسجد چندہ کر کے بنوائی، پختہ کنواں تیار کرایا جس میں پنجوقتہ، جمعہ اور عیدین کی نماز ہوتی تھی اور ربیع الاول میں مولوی ہادی علی خاں صاحب مرحوم میلاد شریف بیان کرتے تھے؛

لکھنؤ میں سنٹرل جیل شہر سے بہت دور واقع ہے اور ہمارے مکان سے اس کا فاصلہ چھ سات میل سے کم نہیں ہے، وہاں کی حاضری بڑی سخت تھی اور ۵ بجے صبح کو پھاٹک کے اندر داخل ہو جاتا

ضروری تھا، شام کو غروب آفتاب کے بعد چھٹی ملتی تھی راستہ میں بالکل ویران، غیر آباد اور پرخطر مقامات پڑتے تھے، حاضری کی پابندی اتنی سخت تھی کہ ایک مرتبہ کسی لڑکی کا انتقال ہوگیا، والد مرحوم خود تجہیز وتکفین میں شرکت نہ کرسکے اور اپنے ماموں پر اس کام کو چھوڑ کر چلے گئے۔

باوجود طول مسافت کے دینداری کا یہ عالم تھا کہ جیٹھ بیساکھ کے رمضان میں بحالت صوم ہر جمعہ کو ۱۱ بجے سپرنٹنڈنٹ سے چھٹی لے کر آتے تھے اور داروغہ حیدر بخش کی مسجد واقع چوک میں مولانا عبد الحیٔ کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے اور بعد ختم نماز وعظ سن کر ڈیڑھ بجے پھر دھوپ اور لوہ میں سنٹرل جیل واپس جاتے تھے۔

والد مرحوم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ میں نے کسی قیدی کی شکایت کبھی سپرنٹنڈنٹ سے نہیں کی، مجھے قیدیوں پر بڑا ترس آتا تھا اور جہاں تک مجھ سے بن پڑتا ان کے ساتھ نیکی کرتا تھا۔ ان کو اس نیکی کا بدلہ عرصۂ دراز کے بعد یہ ملا کہ ایک مرتبہ وہ ۱۱ بجے رات کو عیش باغ سے سواری پر آرہے تھے اور ان کے پاس کافی رقم بھی تھی جب پل کے قریب پہونچے چوروں نے گھیر لیا اور قصد ایذا رسانی کا کیا والد مرحوم نے ان سے کہا کہ ہم کو ایذا نہ پہونچاؤ جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ تمہارے حوالہ کرتے ہیں، یہ کہہ کر جو کچھ پاس تھا سب حوالہ کردیا، اتفاق سے ان میں دو چور وہ بھی تھے جو بزمانہ ملازمت سنٹرل جیل ان کی ماتحتی میں پریس پر پنچکشی کا کام کرچکے تھے انہوں نے لب ولہجہ سے پہچان لیا اور قدموں پر گر پڑے اور بکمال ندامت کا

اظہار کیا اور جو کچھ چھینا تھا وہ سب حوالہ کر دیا۔ اور سواری کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے آئے اور مکان تک پہونچا گئے۔ صدق اللہ تعالیٰ من عمل صالحا فلنفسہ۔

جیل کی ملازمت والد مرحوم کو بالطبع ناپسند تھی رقیق القلب ہونے کی وجہ سے قیدیون کے تکالیف اور بید وغیرہ کی سزائین دیکھ نہ سکتے تھے، افسران عموماً درشت مزاج و سخت گیر ہوتے تھے وہ خود لکھتے ہین "کہ جیل کی ملازمت بھر کسی وقت بھوک کے وقت نہ غذا نصیب ہوئی نہ نیند بھر سویا نہ اعزا یا احباکی شادی غمی اور درد دکھ میں شریک ہو سکا" آخر تنگ آکر ایک روز بعد نماز تہجد بہت الحاح وزاری کے ساتھ دعا کی کہ "اے ارحم الراحمین اب میرے بنائے کچھ نہین بنتا تو میرے حال زار پر رحم فرما کے مجھکو مشکلات سے نجات دے اول تو مجھے ملازمت جیل سے عزت اور نیکنامی کے ساتھ علحدہ کرا دے دوم تو مجھے ایسا موقع دے کہ مین اپنے اعزا کے ساتھ سلوک کر سکون سوم مجھے ایسا مکان ذاتی عطا فرما جس مین مین اور میرے متعلقین آرام و آسائش کے ساتھ قیام کر سکین۔ چہارم حلال کی آمدنی سے اس قدر عنایت فرما کہ مین فراغت کے ساتھ آپ کھائون اور دوسرون کی بھی کفالت کر سکون"

لکھتے ہین کہ "مسبب الاسباب نے چارون دعاؤن کو شرف قبولیت عطا فرما کے اسی وقت سے راقم کی التجا سے کہین زائد فراخی کے اسباب پیدا کرنے شروع کر دیے"

چند روز کے بعد جیل کی ملازمت سے استعفا دے دیا اور

اور عزت و نیکنامی کے ساتھ قید ملازمت سے آزادی پائی۔

مطبع نامی کا جاری کرنا

لکھتے ہیں، "کہ میری خوش دامن مرحومہ کو مجھ سے از حد محبت و خوش اعتقادی تھی بعد ترک تعلق سنٹرل جیل پریس لکھنؤ خوش دامن مرحومہ نے مجھ سے یہ فرمایا کہ میری خوشی یہ ہے کہ اب کسی کی ملازمت نہ کرو بطریق قرض حسنہ ایک ہزار روپیہ مجھ سے لو اور اپنا ذاتی چھاپہ خانہ کرکے قسمت آزمائی کرو۔ چنانچہ اول دو پریس ولایتی آہنی اور چار پتھر دو رخے اور ایک افتادہ زمین ما فضلہ کو خرید کرکے دو چھپر ڈال کے اس میں مطبع نامی کے نام سے چھاپہ خانہ ماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۰۰ھ مطابق فروری سنہ ۱۸۸۳ء میں جاری کر دیا"

پریس کے کاموں کا مرحوم کو خوب تجربہ حاصل ہو چکا تھا، اس تجربہ کے ساتھ ان کی سعی و محنت، خوش خلقی و صفائی معاملہ نے ان تمام مشکلات کو آسان کر دیا جو نئے پریس کے چلانے میں درپیش تھیں اس زمانہ میں لکھنؤ پریسوں کا مخزن تھا اور کسی جدید پریس کو مختصر سرمایہ کے ساتھ کامیابی سے چلا لینا آسان کام نہ تھا، وہ اپنے گھر میں یکہ و تنہا تھے اور کوئی بھائی یا رشتہ دار شریک حال نہ تھا باوجود اس کے ان کی انتہائی جانفشانی اور شب و روز کی محنت نے اور سب سے بڑھ کر خداوند کریم کے فضل و تائید نے مطبع کو یوماً فیوماً ایسی ترقی دی کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے، جہاں دو پریسوں سے ابتدا ہوئی تھی وہاں تھوڑے زمانہ کے بعد نو پریس چلنے لگے اور اکثر رات دن چلا کرتے تھے پھر بھی کام پورا نہ ہوتا تھا تو دوسرے مطابع میں چھپواتے تھے۔

جہاں چھپر پڑے ہوئے تھے وہاں عالیشان مکان بنوالیا، قرب وجوار
کی جو آراضی یا مکان ملا خرید لیا، اور پھر اس کو حسب منشا تعمیر کرالیا۔

کاروبار کی ترقی اور حاوثات

غرضکہ مطبع نامی برابر ترقی کرتا گیا، اور اس کی شہرت
ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیلتی گئی، تجارت کتب
اسقدر وسیع پیمانے پر ہونے لگی کہ شہر میں مختلف مقامات پر کئی دوکانیں
کھولی گئیں، کانپور، الہ آباد، دہلی، کلکتہ، چاٹگام، اور ڈھاکہ
وغیرہ میں مطبع کی طرف سے دکانیں قائم کی گئیں، اس کے علاوہ
بیسوں ایجنٹ مال لے کر سارے ہندوستان کا چکر لگایا کرتے تھے۔
سیکڑوں کتابیں اجرت دے کر خریدی یا لکھوائی گئیں اور ان کو
شائع کیا گیا۔ نسو کے قریب مطبع میں ملازم تھے جن میں سے بعض کی
تنخواہیں صہ/ یا ۵۰؎ ماہوار تک تھیں، جہاں یہ ترقی کی صورتیں تھیں
وہاں مشکلات و حوادث کا بھی برابر سامنا رہا، کئی مرتبہ آگ لگ گئی
جس سے شدید نقصانات اٹھانا پڑے، سنہ ۱۸۹۱ء میں حج کو گئے اور کئی
ماہ تک انکی غیر موجودگی میں بعض ملازموں نے خوب مطبع کو لوٹا اور ہزاروں
روپیہ کا مال گدام سے غائب کر دیا، دسمبر سنہ ۱۹۰۰ء میں سات ہزار روپیہ
کی چوری ہوگئی جس کا سراغ نہ مل سکا، اسی طرح اور بھی سخت مصائب
پیش آئے جو کاروبار کو ختم کر دینے کے لئے کافی تھے، مگر خدا کا فضل
شامل حال تھا مطبع ان سے جانبر ہوتا رہا، سنہ ۱۸۸۳ء سے سنہ ۱۹۲۱ء تک
والد مرحوم نے براہ راست اپنے انتظام میں مسلسل پریس کا کام کیا،
اس کے بعد ہجوم امراض خصوصاً شدائد ضیق النفس نے انکو گوشہ نشین
اور مطبع کے کام میں منہمک رہنے سے مجبور کر دیا اس عرصہ میں تعداد

مطبوعات تقریبا چھ ہزار اکاون ہوتی ہے،

صحیفہ نامی کا اجرا | جنوری ۱۸۸۰ء مین مطبع نامی نے ہفتہ وار اخبار صحیفہ نامی جاری کیا جس کے اڈیٹر مولانا عبد الحلیم شرر مرحوم اور منیجر خواجہ احمد حسن مرحوم مقرر ہوے۔ یہ اخبار عرصہ تک نیکنامی کے ساتھ جاری رہا پھیر بعد وفات مولانا عبد الحیؒ فرنگی محلی نا معلوم اسباب کی بنا پر بند ہوگیا اس اخبار کا ایک پرچہ جو یکم جنوری ۱۸۸۴ء کا ہے راقم الحروف کے پاس بطور یادگار موجود ہے۔

باب دوم

اشاعت کتب مفیدہ و خدمات علمی، شرفا کی اعانت کرنا نوجوانان قوم کو آوارگی سے بچاکر مفید کام سکھلانا اور برگشتہ حال لوگوں کو مطبع میں جگہ دینا

اشاعت کتب مفیدہ و خدمات علمی | مطبع کے قائم کرنے سے والد مرحوم کا مقصد صرف کسب معیشت و تحصیل زر نہ تھا بلکہ وہ نہایت پاک نفسی وبلند ہمتی سے اس کو علوم مفیدہ کی اشاعت کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے اور اپنی قوم کے بہت سے بیکار اور مفلوک الحال نوجوانون کو مطبع کے کاموں میں لگاکر انکی زندگیوں کو کار آمد و آسودہ رکھنا چاہتے تھے،

وہ اپنی خود نوشت سوانح میں ایک جگہ پر برادر عزیز خواجہ قمر الدین احمد صاحب منیجر مطبع کو مخاطب کرکے لکھتے ہیں:

سلمہٗ۔ "راقم کی رائے میں مطبع کی حالت انسان کی زبان سے

بہت ملتی جلتی ہے۔ جملہ اعضا سے بہتر اور بدتر زبان ہے اگر اچھی اور سچی بات زبان سے نکلی تمام اعضا سے اشرف وممتاز زبان ہے درصورت بری اور جھوٹ بات زبان سے نکلنے کے تمام اعضا سے بدتر بلکہ لائق کاٹ کے پھینکدینے کے ہے تاکہ خلق اللہ اس کے شر اور برائی سے محفوظ رہے ؂

زباں بریدہ بکنجے نشستہ صم وبکم ✱ بہ از انکہ نباشد زبان اندر حکم

یہی حال چھاپہ خانہ کا بھی ہے۔ اگر مطبع سے ایسی کتب طبع ہو کے شائع ہوں جن کے مطالعہ کا اثر انسان کے اخلاقی حالت پر اچھا پڑے اور انسان کو برگزیدہ اخلاق بنا دے تو مطبع سے زائد کوئی ضروری اور شریف پیشہ کی چیز نہیں ہم خرمہ و ہم ثواب اسی کا نام ہے۔ ہر شریف النفس کو اس کی اعانت درمے، قدمے، سخنے فرمانا واجبات سے ہے اگر اس کے برعکس مخرب اخلاق کتب چھاپ کے فروخت کرے تو ایسے مطبع کے جاری رہنے سے بند ہو جانا مناسب حال ہے، تاکہ خلق اللہ اس کے شر اور نقصان سے محفوظ رہے"

جہانتک مجھے علم ہے انہوں نے اپنے چہل سالہ زمانہ انتظام میں کوئی کتاب یا اشتہار جو خلاف شرع و مخرب اخلاق ہو نہیں چھاپا، نہ کبھی کوئی تصویر یا سگرات وغیرہ کے اشتہارات چھاپے، عربی اور فارسی زبان کی سیکڑوں مفید کتابوں کے بیش قرار معاوضے دے کر

اردو میں ترجمے کرائے اور شائع کئے، علاوہ بہ کثرت ترجموں کے اصل تالیفات بھی لکھوائیں، جن اصحاب کو یہ کام سپرد کرتے تھے وہ بڑی قابلیت اور شخصیت کے لوگ ہوتے تھے، جیسے مولانا شیخ محمد تائب مرحوم، مولانا سید رمضان علی مرحوم، حکیم مرزا محمد مہدی مرحوم، حکیم مولوی عبدالعلیم مرحوم سید جلال شاہ اندرابی مرحوم، مولوی محمد عبدالوہاب صاحب وغیرہ وغیرہ۔ سب سے بڑا احسان والد مرحوم کا یہ تھا کہ انھوں نے بہت سی ایسی کتابیں شائع کیں جو نادر و نایاب تھیں، قانون شیخ الرئیس کامل، طب یونانی کی وہ ضخیم پانچ جلدوں کی کتاب ہے جس پر طب کا دار و مدار سمجھا جاتا ہے، ہندوستان میں کسی بڑے سے بڑے مطبع کو بھی اس کے طبع کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی، مصر اور طہران کا قانون بھی ہندوستان میں عنقا ہو رہا تھا، والد مرحوم کو چونکہ طب یونانی سے خاص شغف تھا اور اس کی اشاعت کو بقائے طب کے لئے ضروری سمجھتے تھے اسلئے ۱۹۰۵ء میں اس کے طبع کرنے کا خیال آیا، اور بڑے اہتمام سے اس کی ابتدا کی، قلمی اور مطبوعہ نسخے جس قدر مل سکے مہیا کئے، تصحیح و درستی کے لئے قابل قابل حکیموں کا اسٹاف رکھا، حکیم مرزا محمد مہدی مرحوم کو حواشی لکھنے کا کام سپرد کیا الغرض کئی سال کی محنت اور ہزاروں روپیہ کے صرف سے قانون کامل چھپ کر تیار ہوا۔ اور اطباء و طلباء کی آرزوئیں پوری ہوئیں، یہ مطبع نامی کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس پر والد مرحوم بھی فخر کیا کرتے تھے،

یہ امر بھی قابل اظہار ہے کہ انھوں نے اپنی عالی ہمتی سے یہ کار اہم تو انجام دے دیا مگر مطبع کی تجارت کو اس سے بہت شدید نقصان

پہنچ گیا، جو کتابیں روز مرہ کی بکنے والی تھیں ان کی طباعت کئی سال کے واسطے رُک گئی، مطبع کا میل ٹوٹ گیا جو کتابیں یہاں کی مقبول و مطبوع تھیں وہ دوسرے مطابع نے چھاپ لیں اور تاجران کتب ان کی طرف جھک گئے، قانون کے خریدار ایک خاص جماعت میں محدود تھے ہزاروں روپیہ اس میں پھنس چکا تھا اور جلد نکاسی کی کوئی صورت نہ تھی مجبوراً اس کی قیمت گھٹا دی اور لاگت سے بھی کم پر فروخت کرنا شروع کیا، صدہا جلدیں طول مدت سے پڑے پڑے دیمک کی نذر ہو گئیں اور نقصان پر نقصان اُٹھانا پڑا والد مرحوم اس نتیجہ کو پہلے سے جانتے تھے مگر اس گراں بہا علمی خدمت کے مقابلہ میں وہ نقصان برداشت کرنے کے لئے تیار ہو چکے تھے،

قانون تو پھر درسی کتابوں میں تھا اور تیس پینتیس برس میں بک گیا زہراوی کا چھاپنا انہیں کا کام تھا اور اس کی اشاعت میں قطعاً شدید مالی نقصان متصور تھا۔ مگر انہوں نے اس کی مطلق پروا نہ کی اور علمی خدمت کے ذوق اور قومی محبت کے جوش میں نہ صرف اس کو بلکہ اس کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب، لغات قطبیہ کے نام سے تالیف کرا کے دونوں کو شائع کرا دیا،

زہراوی کا پورا نام "التصریف لمن عجز عن التالیف" ہے اس کے مصنف ابو القاسم خلف ابن عباس الزہراویؒ ہیں جن کو یورپ میں Alzahravius و Bucasis اور Albucasis کہتے ہیں، وہ اسپین کے باشندہ تھے اور ۹۳۶ء میں بمقام مدینۃ الزہری جو مضافات قرطبیہ سے تھا پیدا

ہوئے تھے، وہ عبدالرحمٰن خلیفہ اندلس کے طبیب خاص تھے اور مغرب میں طب اور سرجری کے استاد کامل مانے گئے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی تصنیف جس نے ان کو غیر معمولی شہرت اور عزت دی اور جو طب اور سرجری کی انسائیکلوپیڈیا ہے التصریف ہے اور اس کا یورپ کی مختلف زبانوں میں پانچ بار ترجمہ ہوا ہے۔ زہراوی پہلا شخص ہے جس نے جراحی آلات کی صحیح صحیح تصویریں اپنی کتاب میں شامل کیں اگر وہ نہ ہوتے تو آج ہم کو ان آلات کا پتہ نہ چل سکتا جو عرب سرجن استعمال کرتے تھے۔

اس کتاب کی عربی اصل کہیں طبع نہ ہوئی تھی اور ہندوستان ایسے ملک میں جہاں طب یونانی کے جاننے والے آج بھی بکثرت ہیں بہت کم لوگ اس کے نام سے آگاہ تھے، اتفاقاً ایک روز جب کہ ساقی نامۂ شقشقیہ مولفۂ مولوی علی حیدر طباطبائی مرحوم زیر طبع تھا، والد مرحوم کی نظر سے ذیل کے چند اشعار ساقی نامہ میں گذرے اور دل پر ایک چوٹ لگی،

جن کتابوں سے طب نے پایا رواج — جن سے شائع ہوئے اصول علاج
ہے وہ قانون شیخ اور حاوی — اور تصریف ابن زہراوی
وہ حصاۃ مثانہ کا اخراج — وہ سلائی کے پھیرنے کا رواج
قابلہ کا وہ قابل تحسیں — قطع کر کے نکال لینا جنین
عمل ید میں ایسے تھے استاد — کئے آلات سیکڑوں ایجاد
محقن، انبوب، لولب و مجرد — اور مشداخ و مدفع و مجرد
سب نے سیکھا انہیں سے ہے بے شک — عمل و جبر و کسر و رد الفک

اب تو کچھ بھی نہیں رہا ہمیں یاد | پر یہ باتیں ہیں اپنی ہی ایجاد
اپنی میراث بانٹ دی بیجا | وبلینا تلک قسمۃ ضیضی

اُسی وقت سے اُنھوں نے کتاب کی جستجو شروع کر دی آخر بڑی تلاش کے بعد اس کا وہ حصّہ جو سرجری کے متعلق تھا ہاتھ آیا اور انھوں نے ۱۹۰۸ء میں اس کو شائع کر دیا، یہ کتاب سات سو برس پہلے کے مغربی مسلمان اطبا کے کمالات کی زندہ یادگار ہے، افسوس ہے کہ اس نادر کتاب کی چھ سو جلدیں چھپوائی گئی تھیں جن میں سے شاید ۲۵-۳۰ جلدیں فروخت ہوئی ہوں باقی پڑی ہیں یا دیمک کی نذر ہو گئیں ان کے علاوہ طب میں دقائق الحکمت، برأالساعۃ، رسالہ فصد شائع کرایا جو پہلے طبع نہ ہوا تھا اور ارسطو، رازی اور شیخ کے تین رسالوں کا مجموعہ ہے، لغات قطبیہ، جس کا زہراوی کے ساتھ اوپر ذکر ہو چکا ہے علم طب کا ایک مبسوط لغت ہے والد مرحوم نے تالیف کرایا تھا، طب کی درسی کتابوں میں بہت سی کتابیں چھپوائیں اور عربی و فارسی کے بہت سے مفید رسائل کے ترجمے کرائے، اردو میں تشریح کی کتابیں اُس وقت نہ تھیں، تشریحات قطبیہ اور تشریحات تمسیہ تالیف کرائیں، تاریخ میں واقدی کی کتابوں کا ترجمہ کرایا لغت میں اشرف اللغات جس میں عربی، فارسی اور اُردو الفاظ کے معنے لکھے ہیں اور لغت کی بہت مستند اور مبسوط کتاب ہے تالیف کرا کے شائع کی، اس کے علاوہ لغات نادرہ و لغات معجمہ و لغات مقلوبہ و لغات مہملہ و دستور الشعرا و مصطلحات اردو لکھوا کر چھپوائیں، جنتری صد سالہ تالیف کرا کے شائع کی جو بے حد مفید چیز ہے،

گلستاں، بوستاں، سکندر نامہ، یوسف زلیخا، کریما، ما مقیما، دستور الصبیان اور فارسی کی بہت سی درسی کتابوں کے ترجمے اور فرہنگ شائع کئے۔

سنہ ۱۹۰۶ء میں کلیات خواجہ حافظ خاص اہتمام سے طبع کیا، پہلے ایک کنوجارہ مختلف قلمی و مطبوعہ نسخے دیوان حافظ کے، بڑی محنت سے جمع کئے اور سید جلال شاہ صاحب اندرابی مرحوم کو ترتیب و تصحیح کے لئے مقرر کیا جنہوں نے خاتم شعراء فارس حضرت خواجہ عزیز الدین عزیز مرحوم کے مشورہ سے مدت دراز میں کلیات کو مرتب کیا اور مطبوعۂ سابق سے ۱۲۰۳ اشعار اضافہ کئے، اور حواشی لکھے، بعد اصطلاحات صوفیہ کو بصورت رسالہ جمع کرنے کی خدمت راقم الحروف کے سپرد کی جس نے استاذین مکرمین حضرت خواجہ عزیز مرحوم و سید جلال شاہ صاحب مرحوم کی ہدایت و رہنمائی سے اس کام کو پورا کیا، اور خدا خدا کرکے کلیات شائع ہوا استاذی حضرت عزیز مرحوم نے حسب ذیل قطعۂ تاریخ تحریر فرمایا۔

صاحب مطبع نامی گرامی کہ بود — قطب دین، مرکز اسلام۔ مدار ایماں
خواست تا جمع کند جملہ کلام حافظ — سعیہا کرد و بمقصود رساندش یزداں
نسخہائے کہن آورد بکف از ہر جا — آنچہ در خورد رقم یافتہ برچید ازاں
طبع کردش چو بہ تحقیق و بہ تصحیح تمام — ہمہ مطبوع طبائع شد و مقبول جہاں
حافظ آنست کنش آیات بود در ایں ابیات — حافظ آنست کہ مصحف بودش ایں دیواں
حافظ آنست کہ در میکدۂ صدق و یقین — خود بود میکش و خود ساقی و خود پیر مغاں
ہست ہر سطرے ازاں موج شراب معنی — ہست ہر دائرہ اش جام رحیق عرفاں
قطرہ قطرہ کہ فراہم شدہ دریائے گشت — جرعہ جرعہ کہ بہم آمدہ شد رطل گراں

بسکہ عام است بہر کس کرم پیر مغاں | نقد جانے ببر و در طلب گرانے لبتاں
در میخانہ کشادند و صلائے دادند | میزباں پیر مغاں آمد و مستاں مہماں
می سرانید بہ دف مغبچگان ایں مصراع | مژدہ اے ہند شد اینجا مے شیراز ارزاں (سنہ ۱۹۰۰ء)

دیوان حافظ کے علاوہ بیسیوں فارسی اور اُردو کے ایسے دیوان شائع کئے جو نایاب اور غیر مطبوع تھے، قومی کتابوں کی اشاعت سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے اور قومی نظموں میں مسدس حالی کو بہت پسند کرتے تھے متعدد بار اُس کو خاص اہتمام سے چھپوایا اور قیمت تقریباً لاگت کی اتنی رکھی اگر کوئی شخص عوام الناس کے فائدہ کی کوئی کتاب لکھ کر لاتا تھا تو بمعاوضہ یا بلا معاوضہ اُس کو لے کر شائع کر دیتے تھے اور اکثر مفید کتابیں مفت بانٹا کرتے تھے، میلاد شریف اور نعتیہ رسالے بہت عقیدت سے چھاپتے تھے، حضرت مولانا ہادی علی خاں صاحب جو اپنے وقت میں بہترین میلاد خوان تھے اور والد مرحوم کو ان سے بڑی عقیدت اور محبت تھی انسے بارہ رسالے میلاد کے لکھوا کر شائع کئے، حضرت محسن کاکوری جو شیفتہ رسولؐ اور بہترین نعت گو تھے ان کے تمام رسائل ان سے لے کر شائع کئے، اکثر مطبع میں تشریف لاتے تھے اور والد ان کی بڑی عزت اور خاطر کرتے تھے، انکا ایک رسالہ جس کا مطلع ہے ؂

للہ الحمد شب غم نے اُٹھایا بستر | مرحبا طالع بیدار مبارک ہو سحر

شروع سے آخر تک راقم الحروف کو حفظ یاد کرا دیا تھا اور اکثر شب کو فرصت کے وقت سنا کرتے تھے۔ اسی طرح استاذنا و استاذ اساتذنا حضرت خواجہ عزیز رہ کی تمام نعتیہ فارسی نظمیں شائع کیں اور مفت تقسیم کیں ان میں سے ہفت بند عزیزی بہت پسند تھا، راقم الحروف کو

حفظ یاد کرایا تھا اور اکثر بہت شوق سے سماعت فرماتے تھے۔

نکاح نامہ سب سے پیشتر انہوں نے چھپوایا، پہلے ہاتھ سے لکھا جاتا تھا اور لوگوں کو دشواری پیش آتی تھی، جب کوئی وبا شہر میں پھیلتی تو بزرگوں سے دعائیں اور حکماء سے دوائیں دریافت کرکے چھپواتے اور مفت تقسیم کرتے، رمضان میں نقشہ اوقات نماز و افطار و سحر و مسائل صوم چھپوا کر مفت بانٹتے، اہل علم کی خدمت کرنے کو اپنی سعادت سمجھتے، جو حضرات بیکار ہوتے اور انکی گنجائش ہوتی تو ملازم رکھ لیتے اور عزت کا برتاؤ کرتے ورنہ اُجرت پر کام لیتے، حاصل یہ ہے کہ مذہبی، قومی، اخلاقی، درسی، طبی اور ادبی لٹریچر کے تصنیف و تالیف کرانے اور اس کی اشاعت کرنے میں انہوں نے اتنا بڑا حصہ لیا کہ بجز مطبع منشی نولکشور کے مشکل سے کوئی ایسا مطبع نکل سکیگا جو ان کے پریس کی ہمسری کا دعویٰ کرسکے، اس باب میں ان کے خدمات کے متعلق ہمنے جو کچھ لکھا ہے محض اپنے محدود علم اور یادداشت کی بنا پر سرسری طور سے لکھا ہے، ورنہ اگر ریکارڈ کو دیکھکر جو مطبع میں محفوظ ہے ہم ان کے علمی خدمات پر تفصیل سے روشنی ڈالیں تو جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے دس گنا مضمون بڑھ جائے گا۔

شرفا کی اعانت کرنا، نوجوانان قوم کو آوارگی سے بچاکر مفید کام سکھلانا اور برگشتہ حال لوگوں کو مطبع میں جگہ دینا

مطبع کے قیام کا زمانہ وہ تھا جب کہ غدر کے خراب نتائج و اثرات باقی تھے، اور باشندگان لکھنؤ خصوصاً مسلمان شرفا سخت تباہی اور بربادی میں گھرے ہوئے تھے، والد مرحوم کی نظر جب اپنے اعزا و اقارب پر پڑتی تھی تو ان میں آسودہ حالی اور فارغ البالی

کا کہیں پتہ نہ ملتا تھا، اور جس طرح عہد شاہی میں کشمیری مسلمان اوج ترقی پر تھے ویسا ہی غدر کے بعد ان میں تنزل رونما ہو گیا تھا دولتمند اپنی دولت اور ہنرمند اپنے ہنر کھو چکے تھے، نوجوانوں کی حالت نہایت ابتر اور یاس انگیز تھی، ایسی حالت میں انہوں نے صرف اپنے آپ کو نہیں سنبھالا بلکہ اپنے گرتے ہوئے بھائیوں کو بھی سنبھالنے کی پوری کوشش کی،

مطبع میں جب کوئی جگہ نکلتی تو سب سے پہلے اپنے عزیز کو دیتے اگر اس میں کام کرنے کی قابلیت نہ ہوتی تو خود کام سکھلاتے، یتیم بچوں پر زیادہ توجہ رہتی، ایسے بچوں کو بجائے مفت خوری کا عادی کرنیکے لکھنا پڑھنا سکھلاتے ان کی کفالت کرتے اور جب وہ کوئی کام کتابت وغیرہ کا سیکھ جاتے تو ان کو مطبع میں جگہ دے دیتے!

بیسیوں عزیزوں اور شریفوں کو جو بے روزگار اور پراگندہ حال تھے مطبع میں جگہ دی۔ ہمیشہ ان کی کمزوریوں سے چشم پوشی کرتے اور کام بگڑ جاتا تو درگذر کر دیتے تھے،

بہت سے نوجوان قرابت داروں کو جو بیکار پھرتے تھے کتابت اصلاح سنگی اور تصحیح کا کام مطبع میں سکھلوایا۔ جن میں ایسے بھی تھے کہ بے پروائی اور والدین کی خوش حالی سے کام سیکھنے پر توجہ نہ کرتے تھے والد مرحوم ان کو سمجھا کر راضی کرتے اور پند و نصائح سے کام سیکھنے پر مجبور کر دیتے تھے، اور وہ اس طرح کام سیکھتے تھے کہ گویا والد پر بہت بڑا احسان کر رہے ہیں، زمانہ کا انقلاب بھی خوب ہے کہ جب والدین کی خوشحالی باقی نہ رہی اور بال بچوں کا بوجھ سر پڑا تو یہی سیکھے ہوئے

ہنر کام آئے، اس وقت بھی ان میں سے للغگ، ادرفہ، مہینہ کے ملازم موجود ہیں، جن اعزا کو انھوں نے کام سکھلا دے ان میں سے بعض کے اسمار مجھکو بھی معلوم ہیں اور وہ یہ ہیں۔

خواجہ محمد انوار، نواب عبدالباقی، خواجہ حافظ علی، خواجہ نوار الحسن خواجہ اصغر علی، خواجہ محمد نور، خواجہ عبدالحی، خواجہ معین الدین، خواجہ محمد احسن قریشی، خواجہ ثابت علی، خواجہ احسن علی، خواجہ افضل علی خواجہ اطہر علی، خواجہ یوسف علی،

یہ تو اعزا کا ذکر تھا، دیگر شرفا و نوجوانان شہر اس کے علاوہ ہیں اور ان کی فہرست بہت طولانی ہے، والد مرحوم نے اپنے تذکرہ میں ایک جگہ لکھا ہے "کہ راقم نے پانچ وہ حضرات جنھوں نے اپنے اپنے مطابع بسبب تنگدستی بند کر دیے تھے انہیں مطبع نامی میں جگہ دیدی خواجہ عاشق علی کو عملہ صحت میں، نادر حسین خاں کو چوک کی دکان پر، لالہ ماتا پرشاد کو امین آباد کی دکان پر، محمد بخش، حاجی امانت علی، علی حسین خاں کو پریسوں کی نگرانی کے واسطے ملازم رکھ لیا"

تذکرہ لکھنے کے بعد دو صاحبوں کا اور اضافہ ہوا اور اس طرح یہ تعداد سات تک پہونچی ہے بہت سے صاحبان علم و فضل ایسے تھے جو ضرورت مند تھے مگر ملازمت کرنے میں ان کو عار تھا، تصحیح و کتابت یا تالیف کا کام وہ اپنے گھر پر انجام دیتے تھے اور ان کو خفیہ طور سے خود جا کر معاوضہ دے آتے تھے۔

باب سوم

خداپرستی و دینداری، تقویٰ و خشیۃ اللہ، خوش خلقی وکسر نفسی، قوتِ عمل و ذوقِ خدمت خلق، صداقت عفو و رحم، مہمان نوازی، سادگی معاشرت، وضع داری بے تعصبی و صلح پسندی، صفائی معاملات، دور اندیشی

خداپرستی و دینداری یہ بہت آسان ہے کہ انسان دنیا کے کاموں کو چھوڑ کر فقیر بن جائے اور جنگل میں جاکر سکونت اختیار کرلے اور سب جھگڑوں سے آزاد ہوجائے لیکن یہ بہت مشکل ہے کہ انسان دنیا سے پورا پورا تعلق رکھے، اور پھر بھی خدا سے غافل نہ رہے اور آخرت کے کاموں کو نہ بھولے، صحابہ کرام اور سلف صالحین کی یہی زندگی تھی کہ وہ دنیا کے سب کام بھی کرتے تھے اور خدا کو بھی کسی حالت میں نہ بھولتے تھے رجالٌ لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والد مرحوم کی زندگی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ دنیا کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتے تھے اور شب و روز دنیا کے کاموں میں مصروف رہتے تھے مگر میں پورے یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ کسی وقت اور کسی حال میں خدا کو نہ بھولتے تھے اور دنیا کے کاموں کو بھی اس نیت سے کرتے تھے کہ ان کا انجام دینا ایک دینی فرض ہے، صلاحیت نفس اور اگلے بزرگوں کے فیض صحبت سے خداپرستی اور دینداری کا انپر اسقدر غلبہ ہوگیا تھا کہ کسی وقت اور کسی حالت میں اور کسی سوسائٹی کے اندر

رہ کر بھی ان سے علحدگی ممکن نہ تھی،
عقائد ایمانی ان کے دل میں اس درجہ راسخ تھے کہ کوئی قوت انکو اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکتی تھی، شریعت مطہرہ کی عظمت و پابندی کا خیال ان کے رگ وپے میں ساری تھا، چھ سات برس کے سن سے نماز شروع کی ہوگی جو مرتے دم تک کسی حالت میں نہ چھوٹی اور میرے علم میں انکی کوئی نماز قضا نہیں ہوئی، انتقال سے دو روز پہلے بالکل بے ہوش ہوگئے تھے اور اعضا کے حس و حرکت میں فرق آگیا تھا لیکن نماز کے وقت خود بخود ہاتھوں کو ارتعاشی حرکت ہوجاتی تھی اور وہ کانوں کی طرف بلند ہوکر سینہ پر جاکر مل جاتے تھے، ریل کے سفر میں اسٹیشن پر اتر کر نماز پڑھتے تھے اور اس وقت ریل کے چھوٹ جانے کی بھی پروا نہ ہوتی تھی، روزے آخر عمر میں بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے میں نے بہت عرض کیا نہ مانا آخر حضرت مولانا و مرشدنا محمد قیام الدین عبدالباری صاحب نور اللہ مرقدہ سے جاکر عرض کی کہ والد کی عمر ۷۰۔۷۵ سال کو پہونچ چکی ہے، ضیق النفس کے دوروں نے صاحب فراش کردیا ہے آپ تشریف لے چلیں اور سمجھائیں کہ روزوں سے باز آئیں اور فدیہ دے دیا کریں ورنہ ہلاکت نفس کا اندیشہ ہے، حضرت تشریف لائے اور بہت دیر تک سمجھایا گئے کہ یہ خودکشی ہے اور بحکم ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ۔ ایسی حالت میں روزہ رکھنے کی ممانعت ہے تب روزے ترک کئے ہیں لیکن یہ معمول رہا کہ ہمیشہ رمضان کی پہلی تاریخ کو پورے مہینہ کا حساب لگاکر فدیہ دے دیتے تھے۔ مطبع اور گھر کا کام تنہا وہی کرنے والے تھے لیکن جب حج فرض ہوا تو سب کو

خیر باد کہہ کر اُٹھ کھڑے ہوئے، یہ تو فرائض ہیں، سنن و نوافل اور مستحبات
کا اتنا لحاظ تھا کہ کبھی ناغہ نہ کرتے تھے، مسواک کرنے کی ہمیشہ عادت رہی
کھانا بالکل طریقہ مسنونہ پر کھاتے تھے، معاملات تجارت میں جب کوئی
مسئلہ پیش آتا بغیر علما سے پوچھے ہرگز نہ کرتے اور جس بات میں ذرا بھی شک و
شبہ کی گنجائش ہوتی اُس کو ترک کر دیتے، قرآن کریم کی فجر کے وقت
تلاوت کرنا ایسے معمولات سے تھا جو کبھی ناغہ نہ ہوتے تھے۔ قرآن کریم
کے قلمی و مطبوعہ نسخوں کے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا اور جس سے زائد
خوش ہوتے تھے اُس کو کوئی جلد ہدیہ میں دے دیتے تھے، خادم الخدام
روضہ نبوی کو ایک نہایت عمدہ اور مطلا قیمتی نسخہ مولوی محمد ابراہیم صاحب
فرنگی محلی کے ہاتھ مدینہ طیبہ بھیجا۔ انہوں نے شکریہ کا خط تحریر کیا اور
دعائے خیر فرمائی،

تمام عمر کبھی گانا نہیں سنا اور نہ ناچ دیکھا اور نہ غیر محرم عورت کی
طرف قصداً نظر کی اور نہ بے پردہ بات کرنا پسند کی، چوک سے کم
گذرتے تھے کہ زنان بازاری پر نظر نہ پڑ جائے اور جاتے تھے تو نظر
نیچی رکھتے تھے، کبھی کوئی غیر مشروع لباس نہیں پہنا اور نہ اولاد کو
پہننے کی اجازت دی، سگرٹ یا حقہ کبھی نہیں پیا، گرامو فون گھر میں بجتا
تھا تو فوراً اُٹھکر چلے جاتے تھے، میلوں، لہو و لعب کی محفلوں میں
کبھی نہیں گئے، اور نہ کبھی گھوڑ دوڑ گئے، سلف اور بزرگوں کے طریقہ
سے بالشت بھر ہٹنا نہیں چاہتے تھے، ہر امر میں اتباع رسول ؐ کا
شوق تھا، اور خلاف سنت کوئی کام کرنا گوارا نہ کرتے تھے، سود کے
نام سے سخت نفرت تھی اور باوجود وسیع تجارتی کاروبار چلانے کے نہ

سود لیا نہ دیا، والدہ مرحومہ کے ترکہ سے وثیقہ منتقل ہو کر آیا تو اُس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ مذہبی کتابوں کا ہمیشہ مطالعہ رکھتے تھے جس سے انکے معلومات بہت وسیع ہو گئے تھے، مشایخ اور علمار اور جو لوگ پابند شریعت ہوتے تھے اُن کی عزت اور خاطر داری کرتے اور فرماتے کہ میں صرف اللہ کے لئے انسے محبت کرتا ہوں، بزرگان دین سے اپنے واسطے دعا کرانے کا بھی بڑا شوق تھا، حضرت مولانا عبدالشکور صاحب دام ظلہم نے مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا کہ جب مولانا عین القضاۃ صاحبؒ حج کو تشریف لیجانے لگے تو حافظ صاحب میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ اگر آپ ایک کام میرا کر دیں تو میں بہت ممنون ہوں گا میں نے پوچھا تو فرمایا کہ حضرت مولانا صاحب سے عرض کیجئے کہ حرمین شریفین پہنچکر میرے واسطے دعا کریں، میں نے جا کر عرض کیا تو بولے کہ بھائی میں خود دعا کا محتاج ہوں دوسروں کے لئے کیا دعا کرونگا آخر میرے اصرار پر فرمایا کہ انشاء اللہ دیکھا جائیگا، بعد واپسی حج حافظ صاحب نے مجھے دریافت کرنے کے لئے پھر بھیجا تو فرمانے لگے کہ ہاں مجھے یاد رہا اور میں نے ان کے واسطے دعا کی تھی۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے نہایت مخلص مرید تھے اور اکثر ان کی خدمت میں جایا کرتے تھے علمائے فرنگی محل میں حضرت مولانا محمد نعیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بہت عقیدت رکھتے تھے اور انسے بہت فیض حاصل کیا تھا، وہ بھی والد مرحوم پر بیحد شفقت فرماتے تھے اور اولاد کی طرح چاہتے تھے اکثر ان کے حالات بیان کرتے تھے تو آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔

حضرت مولانا شاہ عبد الرزاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا عبد الحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی کمال عقیدت رکھتے تھے اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، حضرت مولانا عین القضاۃ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تقریباً ہر ہفتہ سلام کے لئے جاتے اور راقم الحروف کو بھی ہمراہ لے جاتے، آخر میں حضرت استاذی و مرشدی مولانا عبد الباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جذبات عقیدت و نیاز مندی بہت بڑھ گئے تھے اور ان کا بیحد احترام کرتے تھے حضرت کو بھی والد مرحوم کا بہت پاس و لحاظ تھا اور ان کے سبب سے راقم الحروف پر بھی کمال شفقت فرماتے تھے، جو پدرانہ شفقت سے کم نہ تھی۔

والد مرحوم کو نقیب الاشراف سید محمد مرتضیٰ الجیلانی صاحب السجادۃ القادریہ آستانہ بغداد الاسلامیہ سے بھی بیعت حاصل تھی، لیکن کہاں اور کیونکر بیعت کی یہ نہ معلوم ہو سکا، قلمی شجرہ موجود ہے جس پر شجرہ مکتوبہ زاویہ گیلانیہ سنہ ۱۳۰۹ھ لکھا ہے۔

تقویٰ و خشیۃ اللہ

اسلام میں بزرگی کا دار و مدار صرف تقویٰ پر ہے اور اسی سے فضیلت ہے، والد مرحوم ایک انسان تھے فرشتہ یا معصوم نہ تھے، البتہ خداوند کریم نے اپنے فضل سے یہ صفت ان کو عطا کی تھی کہ وہ ہمیشہ برائیوں سے بچنے کی کوشش کرتے تھے اور خدا سے بہت ڈرتے تھے جو شخص برائیوں سے بچنا چاہتا ہے خدا بھی اس کو برائیوں سے بچاتا ہے اور صحیح راستہ پر چلاتا رہتا ہے کما قال، والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا، خوف خدا کا یہ حال تھا کہ کسی کو گناہ کا مرتکب ہوتے ہوئے دیکھتے تو مضطرب ہو جاتے، اور قرآن شریف یا وعظ و نصیحت کی

باتیں سننے کے بعد ان کو اپنی آنکھوں پر اختیار باقی نہ رہتا، اور بے اختیار رو دیتے، اکثر دعاؤں میں گھنٹوں رویا کرتے یہانتک کہ ڈاڑھی تر ہو جاتی، ادھر دس بارہ سال سے یہ حال تھا کہ جو شخص انسے ملنے آتا اس سے رو رو کر عفو قصور کراتے۔ میں نے اپنی عمر میں انسے زیادہ خوف آخرت سے رونے والا کوئی شخص نہیں دیکھا، یہ کثرت بکا کیوں تھی، اس لئے کہ وہ اللہ سے اور یوم آخرت سے بہت ڈرتے تھے اور یہی سرچشمہ تھا ان کے تمام حسنات کا،

خوش خلقی و کسر نفسی

وہ فطرتاً خوش اخلاق واقع ہوے تھے، امیر غریب، بڑے چھوٹے، اور دوست دشمن سب کے ساتھ ان کا برتاؤ اچھا رہتا، ان کے مزاج میں بناوٹ اور تصنع نہ تھا، جو دل میں ہوتا وہی زبان سے کہتے جو باطن میں ہوتا وہی ظاہر کرتے، جو شخص انسے آکر ملتا وہ خوش ہو کر واپس جاتا، اور جس شخص کو ان سے سابقہ پڑتا وہ ان کا مداح رہتا، ہمیشہ سلام کرنے میں سبقت کرتے چاہے وہ ادنیٰ ملازم یا حقیر ترین انسان ہو، جس محفل میں جاتے سب کے پیچھے کنارہ پر بیٹھتے کبھی آگے نکلنے کی کوشش نہ کرتے، اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے ملازموں سے بہت کم کام لیتے، ضرورت کی چیزیں بازار سے خود جاکر خریدتے اور اُٹھ سکتیں تو خود ہی لے آتے، کبھی کسی کو درشت او نازیبا کلمات نہیں کہے، معمولی معمولی آدمیوں سے کلام کرتے تو آپ سے خطاب کرتے تم یا تو کبھی نہ کہتے، سن شباب میں غصہ مزاج میں بہت تھا اور جلد طیش میں آجاتے تھے لیکن طبیعت پر قابو رکھتے اور غصہ فرو ہونے کے بعد ندامت ظاہر کرکے معافی مانگ لیتے، کسی مزدور یا

نوکر پر خفا ہوتے۔ تو بعد رفع ناراضگی اس کو کچھ رقم دلوا کر خوش کر دیتے
بڑوں اور بزرگوں کو بہت زیادہ جھک کر سلام کرتے اور انکا بیحد
ادب کرتے کسی غریب یا مفلس یا حقیر پیشہ ور کو ذلیل نہ سمجھتے جب وہ
آتا تو اپنے پاس بٹھلاتے، کسی سے کبھی مزاح نہیں کیا نہ طنز وطعنہ
کی بات کہی نہ دل دکھانے والے الفاظ کہے، عجز و فروتنی اس قدر
مزاج میں تھی کہ اپنے آپ کو ساری دنیا کے لوگوں سے حقیر سمجھتے تھے
کبھی اور کسی موقع پر اپنی شان اور نمود دکھانے کا خیال تک دل میں
نہیں کیا، اکثر پیدل پھرتے تھے اور باوجود قدرت کے سواری کرایہ
پر نہیں کرتے تھے، مخاطب کی بات کبھی نہ کاٹتے اور جب تک وہ کلام
کرتا خاموش رہتے، حتی الامکان کسی کا ذکر برائی سے نہ کرتے
اور سخت سے سخت مخالف کو بھی اپنی زبان سے برا نہ کہتے، راقم الحروف
نے خود دیکھا ہے کہ بعض اوقات ان کے مخالفین نے رودررو
ان کو سخت باتیں کہیں، انہوں نے جواب دیا تو یہ دیا کہ تم جو عیوب
میرے بیان کرتے ہو درحقیقت اس سے بہت زائد عیوب مجھ میں
موجود ہیں اللہ مجھے معاف کرے، انہوں نے اپنی ذات کے واسطے
کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا، اور نہ کسی کو آزار پہنچانے کی کوشش
کی، انہوں نے کبھی تعلّی یا بے جا فخر کی کوئی بات نہیں کہی، وہ ہمیشہ
اپنے نام کے ساتھ حقیر، خادم، خاکسار، فقیر، کمترین لکھا کرتے اور
آخر میں غفر اللہ لہ یا عفی عنہ ضرور لکھتے، امرا اور بڑے لوگوں سے
بلا ضرورت کبھی نہ ملتے تھے، زیادہ تر غریب طبقہ سے میل جول رکھتے،

قوت عمل وذوق خدمت خلق

والد مرحوم میں حیرت انگیز قوت عمل تھی، اور

سچ یہ ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں میں اور کم از کم مسلمانوں میں ہمیں ایسے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں جن میں اس قدر زبردست قوت عاملہ پائی جاتی ہو۔ ان کے کام کرنے کی مدت تقریباً ۴۰ سال ہوتی ہے، اس مدت میں باوجود گوناگوں مصائب ومشکلات وخرابی صحت کے انہوں نے مختلف قسم کے جس قدر کام کئے ہیں ہم سو برس میں بھی وہ کام نہیں کر سکتے بچپن اور تعلیم کا زمانہ جس محنت وصعوبت میں طے ہوا وہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں، اس کے بعد ملازمت کا دور اور مطبع کے قیام کا ابتدائی زمانہ ہے جس میں ان کی ترقی کی بنیاد پڑتی ہے، اور درحقیقت وہی ان کی انتہائی سرگرمیوں کا زمانہ رہا ہے، ہمنے ان کا جو زمانہ پایا وہ اس کے بعد کا دور ہے اور اسی کے متعلق ہم زیادہ وضاحت سے لکھ سکتے ہیں جس سے ان کی کارآمد اور مفید زندگی اور ان کے مشاغل پر روشنی پڑ سکے گی،

ان کا معمول تھا کہ بہت سویرے سو کر اٹھتے اور حوائج ضروریہ سے فراغت کر کے کالی مرچیں چبا کر تھوڑی دیر رال بہاتے پھر چائے اور نمک کے جوشاندہ کا غرغرہ کرتے (نزلہ اور کھانسی کی دوامی شکایت نے اس عمل پر مجبور کر دیا تھا) پھر وضو کر کے نماز پڑھتے پھر تلاوت قرآن کرتے پھر سادی چائے کی ایک پیالی پی کر بعد طلوع آفتاب گھر سے نکل جاتے، جس عزیز یا دوست کو سنتے کہ بیمار ہے اس کی جا کر عیادت کرتے اس کی دوا بازار سے لا دیتے اور ضرورت ہوتی تو حکیم یا ڈاکٹر سے جا کر حال بھی کہہ آتے، یہ بھی معمول تھا کہ جس کی عیادت کرتے نہ اس کے یہاں چائے پیتے نہ اس کے گھر کا پان کھاتے ایک مرتبہ

میں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ اس سے ثواب کم ہو جاتا ہے، لاوارث عزیزوں کے مکانوں پر جاکر خیریت دریافت کرتے اور ان کی کوئی ضرورت ہوتی تو اس کو پورا کر دیتے، دو تین گھنٹہ کے بعد مکان واپس آتے اور مطبع کا کام شروع کر دیتے اور غروب آفتاب تک مسلسل کام کرتے تھے اور کسی وقت خالی نہ بیٹھتے تھے البتہ کسی کام سے کہیں جانے کی ضرورت ہوتی تو چلے جاتے، تمام دن بے حد انہماک کے ساتھ کاموں میں مصروف رہتے، مطبع کا کام کرتے، پنچایتیں کرتے، عزیزوں اور دوستوں کے جھگڑے چکاتے، شادی بیاہ کے معاملے طے کرتے، قومی معاملات میں مشورے دیتے، انجمنوں کے کام کرتے، چندے جاجا کر وصول کرتے غرضکہ تمام دن ایک منٹ کے لئے چین سے نہ بیٹھتے - پھر بعد مغرب کھانا کھاکر خطوط لکھتے، حسابات دیکھتے، اخبار پڑھتے، کتابوں کا مطالعہ کرتے اور احیاناً احباب جمع ہو جاتے تو کچھ دیر تک ان کے ساتھ دل بہلاتے، یا راقم سے سنبلستان رحمت، ہفت بند عزیزی، مسدس حالی سنانے کی فرمائش کرتے نصف شب کے قریب بستر پر جاکر آرام کرتے، انکے پروگرام میں سیر، تفریح، یا ہوا خوری کی گنجائش کبھی نہ رہی اور بچپن سے کچھ ایسی محنت کے خوگر ہو گئے کہ محنت ہی ان کے لئے آرام بھی اور کام ہی کو وہ تفریح سمجھتے تھے، یہ کام کرنے کی عادت مرتے دم تک نہ گئی اور ۱۹۲۲ء کے بعد سے بھی جبکہ پیرانہ سالی اور ہجوم امراض نے بیکار اور گوشہ نشین بنا دیا تھا کچھ نہ کچھ کام آخر وقت تک برابر کرتے رہے، آنکھوں کی روشنی اچھی تھی، اور قوائے دماغی قائم تھے اس لئے برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے یا کتابوں کا مطالعہ کرتے یا قرآن شریف کی تلاوت

کرتے، مطبع کے کاغذات اور حسابات بھی روزانہ منگا کر دیکھتے اور سمجھتے رہتے تھے، اکثر تسبیح اور درود شریف کا ورد رہتا تھا، غرضکہ ہر عالم میں بھی جب دیکھا کبھی اُن کو خالی نہ پایا، خلق اللہ کی خدمت کرنے اور لوگوں کو نفع پہنچانے کا اس قدر شوق تھا کہ اپنی ضرورتوں اور گھر کے کاموں کو بھول جاتے تھے، اور دوسروں کے کام کرنے میں ان کو خاص مسرت حاصل ہوتی تھی، جب سنتے تھے کہ کسی پر مصیبت پڑی ہے فوراً اس کی ہمدردی کو پہنچ جاتے تھے اور اپنے خدمات پیش کرتے تھے خواہ وہ دوست ہو یا دشمن ہو، ایک صاحب سے مکان کا مقدمہ چل رہا تھا اور عدالت میں ان کے خلاف دعویٰ کیا تھا جب ان کے یہاں کسی کی بیماری کی خبر سنتے جب تک وہ اچھا نہ ہو جاتا روز عیادت کے واسطے جایا کرتے اور عدالت میں بھی جب ان سے ملتے تو بہت تپاک سے ملتے، شادی بیاہ اور غمی کے متعلق جس سامان اور جن اشیاء کی عام طور سے ضرورت ہوا کرتی ہے وہ سب خرید کر گھر میں رکھ لی تھیں، اور لوگوں کو ضرورت واقع ہونے پر مستعار دے دیا کرتے تھے، نکاح نامے لینے کے لئے اکثر راتوں کے پچھلے پہر میں لوگ آیا کرتے تو خود اُٹھ کر جاتے اور گو دام کھول کر نکاح نامے نکال کر دیتے اور ذرا بھی اس بے وقت کی تکلیف پر منغص نہ ہوتے، دوستوں اور شناساؤں میں جس کے یہاں کسی کے مرنے کی خبر سنتے، تمام کام چھوڑ کر فوراً پہنچ جاتے اور تجہیز و تکفین کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاتے اور جب تک سب کام انجام نہ پا جاتے گھر واپس نہ آتے، میں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ نہلانے کے واسطے بیری کی پتی کی ضرورت ہوئی تو خود توڑنے چلے گئے، تختوں کے لئے، چٹائی کے لئے

کفن کے کپڑے کے لئے خود جاتے تھے اور اس کو ثواب کا کام سمجھکر
خوشی خوشی کرتے تھے، سیکڑوں لاوارث میتوں کی تجہیز و تکفین کرائی
اور جو کچھ خرچ ہوا اپنے پاس سے ادا کیا، گواہی دینے کے لئے جب
کوئی فریق عدالت میں انکو طلب کرتا تھا تو اس سے خوراک نہ لیتے تھے
ایک مرتبہ میں نے سبب پوچھا تو فرمایا خدا کا حکم ہے ولا تکتموا الشہادۃ
لہذا سچی گواہی دینا مذہبی کام ہے اور اس کی اُجرت لینی مناسب نہیں
عزیزوں اور دوستوں کی اعانت کے لئے ہمیشہ جان و مال سے
تیار رہتے اور بڑی سے بڑی قربانی کرنے میں ان کو باک نہ ہوتا، کسی پر
قرضہ کا بار ہو جاتا تو اُس کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتے، کوئی کاروبار
شروع کرتا تو اس کے یہاں سے چیزیں خریدتے اور دوسروں کو
ترغیب دیتے، کوئی عورت بیوہ ہو جاتی یا لڑکا یتیم ہو جاتا تو اسکا خود
کچھ وظیفہ مقرر کر دیتے یا دوسروں سے کہہ کر مقرر کرا دیتے۔ کانپور
میں شیخ ولایت علی مرحوم کا ایک بہت بڑا وقف ہے جس کے متولی
عم مکرم حافظ شیخ محمد ابراہیم صاحب اسپیشل مجسٹریٹ ہیں، لکھنؤ میں
بہت سے مستحقین کو والد مرحوم کی سفارش پر آج تک اس وقف
سے وظائف مل رہے ہیں، طالب علموں کی بھی بہت مدد کرتے تھے،
پڑھنے کے لئے بسا اوقات کتابیں مفت دیدیتے، رہنے کا ٹھکانا نہ ہوتا
تو اپنے مکان پر ان کو جگہ دیتے، انسے اُجرت پر صحت کا کام لیتے،
ان سے کتابوں کا ترجمہ کراتے اور مختلف صورتوں سے ان کے ساتھ
سلوک کرتے رہتے تھے،

صداقت | والد مرحوم صداقت و راستبازی کی مجسم تصویر تھے، یہ وصف

اگلے بزرگوں میں تو موجود تھا مگر آج کل کے لوگوں میں عنقا ہو رہا ہے ان کے ارادہ میں صداقت تھی، قول میں صداقت تھی اور فعل میں صداقت تھی، کبھی کوئی بات غلط یا جھوٹ زبان سے نہ نکالتے تھے کسی کی جھوٹی خوشامد نہ کرتے تھے اور کسی سے جھوٹا وعدہ نہ کرتے تھے ان کا ظاہر و باطن ایک تھا، جو کہتے تھے وہی دل میں ہوتا تھا اور اسی کے مطابق کرتے تھے، وہ پالیسی اور ڈپلومیسی نہ جانتے تھے اور منافقت سے انتہائی نفرت کرتے تھے، جس سے جو وعدہ کر لیتے زمین و آسمان ٹل جاتے مگر وہ اپنے وعدہ سے کبھی نہ پھرتے، جسطرح خود راست باز تھے دوسروں کو بھی راست باز سمجھ لیتے تھے اور اکثر دھوکے کھاتے تھے اور نقصان اُٹھاتے تھے، بڑے سے بڑے دشمن کو بھی ان کی صداقت پر کبھی شبہ نہیں ہوا، جب کوئی بات زبان سے کہتے تو بہت سوچ سمجھکر کہتے اور کسی بات کے کرنے کا ہرگز اقرار نہ کرتے جب تک کہ اس پر کلیۃً آمادہ نہ ہو جاتے، انہوں نے کبھی کسی کو دھوکہ یا فریب نہیں دیا نہ مغالطہ میں رکھا جو بات ہوئی صاف کہدی خواہ بھلی معلوم ہو یا بری، اس وصف نے بارہا انکو سخت مشکلات و مصائب میں مبتلا کر دیا لیکن ان کی کامیابی کا راز بھی یہی وصف تھا، اور ان کی عزت و نیکنامی بھی اسی سے ہوئی دینی اور مذہبی معاملات میں ان کی صداقت حد سے بڑھی ہوئی تھی اور اُن کاموں میں وہ نفسانی خیالات کو پاس بھی نہ پھٹکنے دیتے تھے، اور ان کو ذاتیات سے مبرا رکھنا چاہتے تھے ان کو کسی حالت میں یہ بات گوارا نہ تھی کہ کوئی کام خدا کے لئے کریں اور اس میں نفس یا دنیا کی

ادنیٰ اشتراکت بھی رہے۔ ایک بار فرمانے لگے کہ مجھے نہیں معلوم کہ میرا
حج بھی ادا ہوا یا نہیں میں نے پوچھا کیوں۔ فرمانے لگے کہ سنہ ۱۸۹۱ء
میں میں نے اخبار میں دیکھا کہ عثمان پاشا حجاز کے گورنر مقرر ہوئے ہیں
پلونا کے محاصرہ میں عثمان پاشا نے جس اسلامی صبر و استقامت اور
بہادری کا ثبوت دیا تھا اس کی بنا پر میرے دل میں جوش اُٹھا کہ میں
ان کی زیارت کر کے ان کے قدموں کو اپنی آنکھوں سے لگاؤں، اور
میں نے حج کا ارادہ کر دیا کہ یہ فرض بھی ادا ہو جائے گا اور یہ آرزو بھی
پوری ہو جائے گی وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ یہ عثمان پاشا کوئی اور ہیں
پلونا والے نہیں ہیں۔

راقم الحروف کو اکثر نصیحت فرماتے کہ جو کام خدا کے واسطے کرنا
اس میں نفس یا دنیا کی شرکت نہ رکھنا، خدا ایسے عمل کو کبھی قبول نہیں
کرے گا جس میں دوسرے کی شرکت ہوگی ؎

ہم خدا خواہی و ہم دنیائے دوں — ایں خیال است و محال است و جنوں

یہ بھی نصیحت فرماتے تھے کہ جو کام خدا کے لئے کرو اس میں لومۃ لائم
یا کسی کے کہنے سننے کی کبھی پروا نہ کرو، لوگ برا کہیں گے تو خدا کے
یہاں اجر بڑھے گا کوئی نقصان نہ ہوگا۔

عفو و رحم | مرحوم بے حد رقیق القلب تھے اور کسی حیوان یا انسان کی
تکلیف دیکھ نہ سکتے تھے۔ اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "کہ میری ولادت
کے آٹھویں دن والدہ کا دودھ خشک ہو گیا اور میں نے ڈیڑھ سال تک
بکری کے دودھ سے پرورش پائی اور شاید اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ رقیق القلب
ہوں اور مجھ سے کسی کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔"

کسی کو بھو کا دیکھتے تو فوراً گھر سے کچھ کھانا منگا کر دے دیدیتے، اور جو جب کھانا کھانے بیٹھتے تو روٹی کے ٹکڑے کر کے جانوروں کے آگے پھینکتے جاتے چڑیوں کیلئے دانہ مقرر تھا اور چھینکوں میں دانہ پانی لٹکا دیا جاتا تھا، چیلوں اور کوؤں کے لئے طشت میں علیحدہ پانی بھروا کر رکھوا دیتے تھے عمر بھر کسی جانور کا شکار نہیں کیا اور نہ شکار سے رغبت تھی، جب کوئی ملازم یا خطاکار عذر خواہ ہوتا تھا تو معاف کر دیتے تھے اور سزا نہ دیتے تھے۔ بیسیوں ملازموں نے چوریاں کیں اور بگڑے گئے، جب خطا کا اقرار کر لیا اور معافی مانگی تو ہمیشہ ان کی خطا سے درگذر کی، متعدد ملازموں اور کارندوں نے خیانتیں کیں اور بگڑے گئے لیکن کسی کو کبھی پولیس کے حوالہ نہیں کیا نہ سزا دلوائی، تقریباً ۱۵ سال ہوئے کہ ایک دیرینہ ملازم پر بائیس ہزار روپیہ کا غبن ثابت ہوا اور ثبوت اس قدر صاف تھا کہ اس کو اقرار کرنا پڑا سب نے مشورہ دیا کہ پولیس کے حوالہ کیا جائے اور سزا دلوائی جائے مگر چونکہ پرانا ملازم تھا اور معذرت خواہ تھا معاف کر دیا اور کوئی کارروائی اس کے خلاف نہیں کی،

جن لوگوں نے ان کے ساتھ متعدد برائیاں کی تھیں اور ان کو نقصان پہنچائے تھے ان کے ساتھ بھی کبھی برائی نہ کی بلکہ انپر وقت پڑا تو ان کا ساتھ دیا اور ان سے بھلائی کی،

یہی نہیں بلکہ جو لوگ کسی وقت پر ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کے درپے ہوئے تھے موقع ملنے پر انسے بھی انتقام نہیں لیا اور انکو معاف کر دیا،

ان کے حلم وعفو کی اس کثرت سے مثالیں موجود ہیں کہ اگر ہم انکو یہاں پر نقل کریں تو رسالہ بہت طویل ہو جائے گا، اس لئے نظر انداز کرتے ہیں۔

مہمان نوازی والد مرحوم کو مہمان نوازی کا بڑا شوق تھا جو عرب کی سنت اور مسلمانوں کا خاص شیوہ ہے، مشکل سے کوئی زمانہ ایسا ہوتا تھا کہ ان کا مکان مہمانوں سے خالی رہتا تھا، وہ مہمانوں کے قیام سے بہت خوش ہوتے تھے اور ان کی بے حد خاطر کرتے تھے، ایک مرتبہ پیلی بھیت کے ایک غریب اور شریف شخص دو سال تک مسلسل مقیم رہے، وہ بیمار تھے ان کو حکیم عبدالعزیز صاحب مرحوم کے پاس لیجا کر دکھلاتے تھے، انکی دوا خود بازار سے خرید کر لاتے اور اپنی نگرانی میں اپنی صاحبزادی سے دوائیں تیار کرا کے ان کو پلواتے رہے، ان کے واسطے پرہیزی کھانا پکتا تھا، اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے، دو سال کے بعد وہ مکان چلے گئے اور تھوڑے روز کے بعد پھر واپس آئے تو بہت مدت تک مقیم رہے، وہ اکثر طالب علموں کو رہائش کے لئے جگہ دے دیتے تھے اور بن پڑتا تھا تو کھانے کا بھی انتظام کر دیتے تھے، جب کوئی مہمان مقیم ہوتا تو اس کے واسطے خاص تاکید سے عمدہ کھانے پکواتے اور جب تک وہ کھانہ لیتا خود کھانا نوش نہ کرتے، اگر کوئی مہمان بیمار پڑتا تو خاص عزیزوں کی طرح اس کی تیمارداری کرتے اور اس کی صحت کے لئے بے چین رہتے، اکثر مہمان مدتوں تک ان کے یہاں ٹھہرے رہتے، انھیں اس سے ناگواری نہ ہوتی بلکہ اس کے رخصت ہونے پر افسوس ظاہر کرتے،

باہر سے اعزا یا احباب اگر لکھنؤ آکر کسی دوسری جگہ ٹھہر جاتے تو ان کو ناگوار ہوتا اور شکایت کرتے، اور پیشتر سے کسی کے آنے کی اطلاع ہوتی تو خط بھیجکر اپنے یہاں ٹھہرنے کی درخواست کرتے،

سادگی معاشرت

انکا طرز معاشرت باوجود کافی دولت مند ہونے کے بیحد سادہ تھا، کھانا بہت معمولی کھاتے اور عام طور سے صرف ایک سالن دسترخوان پر ہوتا تھا، دال یا چاول بھی نہ ہوتے تھے، دودھ کی البتہ عادت تھی اور اطبا کی تاکید تھی کہ اس کو کبھی نہ چھوڑیں، انکو پُرتکلف کھانوں کا شوق نہیں ہوا اور نہ کسی کھانے کو کبھی برا کہا، پسند آیا کھالیا ناپسند ہوا چھوڑ دیا، چائے کا بہت شوق تھا ناشتہ کبھی نہیں کیا اور بجز صبح وشام کے کھانے کے اور کسی وقت کوئی چیز زبان پر نہ رکھتے تھے کبھی کوئی چیز فرمائش کرکے نہ پکوائی، پھلوں میں بجز تخمی آم کے کسی سے رغبت نہ تھی، کھانا بہت تھوڑا کھاتے تھے اور بعض اوقات اس قدر تقلیل غذا فرماتے تھے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی کہ ان کا پیٹ کیونکر بھرتا ہے، رمضان میں افطار کے وقت صرف ایک ٹکیہ، دو کباب تھوڑا دودھ اور چائے پیتے تھے، اس کے علاوہ کوئی چیز زبان پر نہیں رکھتے تھے،

لباس کی سادگی کا یہ حال تھا کہ گاڑھا، ہارکین، کھدر اور معمولی درجہ کی چھالٹیں یا نین سکھ کا کرتا، پائجامہ اور اچکن پہنتے تھے، اور جاڑے میں بہت ارزاں قسم کے دیسی پشمینہ کے کپڑے پہنتے تھے، ٹوپی جوتا اور رومال بہت سستا اور معمولی قسم کا ہوتا تھا، کبھی کوئی رنگین پرتکلف اور قیمتی کپڑا انہیں پہنا، ہم لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ

تمہاری صرف ٹوپی اتنی قیمتی ہوتی ہے کہ میرا تمام لباس اس قیمت کا نہیں ہوتا انکے تخت اور پلنگ کا بستر بھی معمولی ہوتا تھا، اکثر ہرن کی کھال بچھاتے تھے اور کبھی کھرّے تخت پر بیٹھے رہتے تھے، آخر عمر میں سوائے کھدر اور گاڑھے کے دوسرے کپڑے کا لباس نہ بناتے تھے کھدر کے موٹے کرتوں اور گھٹنوں سے بدن کی کھال سرخ ہو جاتی تھی اور تکلیف محسوس کرتے تھے مگر ان کو پرواہ نہ ہوتی تھی۔ اور باریک لباس اختیار نہ فرماتے تھے، وہ اپنی ضرورت کی تمام چیزوں میں سادگی کا لحاظ فرماتے تھے اور آرام طلبی یا نمائش کو دخل نہ دیتے تھے، لوٹا۔ کٹورا۔ پیالہ، گلاس، پلنگ، تخت، چوکی، الماری، صندوق غرضکہ ان کی ضرورت کی جس قدر محدود چیزیں تھیں سب بہت معمولی اور سادگی کی تصویر تھیں، ان کے کسی کمرے میں فرنیچر یا آرائش کی چیزیں نہ رہتیں، اور غیر ضروری چیزوں کے پاس رکھنے سے سخت نفرت تھی، ان کی سادگی وضع کے سبب سے جب کوئی ناواقف شخص کسی مجلس یا راستہ میں ان کو دیکھتا تو بہت ہی غریب اور معمولی انسان سمجھتا، وہ اس کو محسوس کرتے لیکن کبھی اس کی فکر نہ کرتے کہ لوگ ان کو اس مرتبہ کا سمجھنے لگیں جس مرتبہ کے وہ انسان ہیں۔

وضع داری وضع کی پابندی لکھنؤ کے اگلے شرفا کی امتیازی صفت تھی اور مرحوم میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی، ان کے جاننے والے جانتے ہیں کہ جس امر میں انہوں نے جو وضع اختیار کی مرتے وقت تک اس کو اسی طرح نبھا گئے، جس کے ساتھ جو برتاؤ شروع کیا اس کو ہمیشہ قائم رکھا، جس کے لئے کھڑے ہوتے تھے اس کے لئے ہمیشہ کھڑے

ہوتے رہے جس کو پان دیتے تھے اُس کو بغیر پان کھلائے نہ جانے دیتے
تھے، جس کو چائے پلاتے تھے اُس کو بغیر چائے بنوائے اور پلوائے
ہوئے اُٹھنے نہ دیتے تھے، جسکو دوست کہا اُس کو دوست ہی کہتے رہے
اور جس کو جس لقب سے یاد کیا اُس کو اُسی لقب سے یاد کرتے رہے تحریر
میں جو عنوان کسی کے لئے ایک مرتبہ قائم کیا وہ عمر بھر نہ بدلا، لوگوں کے
حالات بدل جائیں اور زمانہ متغیر ہو جائے مگر ان کا برتاؤ کبھی نہ بدلتا تھا
کھانے میں پینے میں، لباس میں، طرز معاشرت میں عادات میں، معاملات
میں غرضکہ ہر چیز میں وہ ایک وضع پر چلتے تھے جس کو کبھی نہ بدلتے تھے
عرصہ ہوا کہ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ پیدل چلنے میں آپ کو بہت
تکلیف ہوتی ہے، سواری رکھ لیجئے خدا نے آپ کو مقدرت بھی دی ہے
فرمانے لگے "کہ اگر اس کا یقین دلا دو کہ میں عمر بھر سواری رکھ سکوں گا
اور اس کو نبھائے جاؤں گا تو سواری رکھنے کو تیار ہوں"

جس شخص کو ملازم رکھتے تھے اس کو کبھی برطرف نہ کرتے تھے،
جرم یا خطا کرنے پر خفا ہو لیتے مگر نوکری سے علیحدہ نہ کرتے، آج کل
کے لوگوں کی طرح دائرہ احباب وسیع کرنے کا شوق نہ تھا اور نہ
ہر شخص پر جلدی سے اعتماد کر لیا کرتے تھے، اور نہ ہر ملنے والے کو دوست
کہتے تھے، ایک مرتبہ مجھ سے پوچھا کہ تمہارے کچھ دوست بھی ہیں میں نے
کہا بہت ہیں کہا اچھا کچھ دوستوں کے نام بتاؤ میں نے نام بتائے تو
فرمایا کہ ان میں سے کوئی بھی تمہارا دوست نہیں ہے اور وقت پڑنے
پر امتحان ہو جائے گا، اپنے متعلق فرمایا کہ مجھے تمام عمر میں صرف دو تین
دوست ملے ہیں مگر وہ سب دنیا سے رخصت ہو گئے اب میرا کوئی دوست

باقی نہیں ہے، ایک مرتبہ مجھے ایک صاحب کی دوستی پر بڑا اعتماد تھا اور میں
ان کا ایک کار اہم بجد ستعدی سے انجام دے رہا تھا فرمانے لگے کیوں
وقت ضائع کرتے ہو یہ شخص تمہارا دوست نہیں ہوگا اور تمکو دھوکا دیگا،
آگے چل کر ثابت ہوا کہ انکی رائے بالکل صحیح تھی،

بے تعصبی و صلح پسندی | والد مرحوم باوجودیکہ بہت پکے مسلمان اور سچے دیندار تھے
لیکن ان میں تعصب کو دخل نہ تھا، وہ کسی مذہب کے پیرووں کو نفرت کی
نگاہ سے نہ دیکھتے تھے بلکہ دوسرے مذہبی پیشواؤں کی تعظیم کرتے تھے، انہیں
غیر مذہب والوں کے ساتھ حیرت انگیز رواداری تھی اور مذہبی جھگڑوں اور
مناقشوں کو بہت مذموم اور تباہ کن سمجھتے تھے، انہوں نے دنیاوی
معاملات میں غیر مسلموں کے ساتھ کبھی تعصب نہیں برتا اور نہ کبھی کسی کو
انسے شکایت پیدا ہوئی، انکے مطبع میں بڑی تعداد ہندو ملازمین کی
تھی، جن کو ذمہ داری کے بڑے بڑے عہدے دے رکھے تھے اور بعض
ان میں ایسے بھی تھے کہ مثل اولاد کے ان کے ساتھ محبت کرتے تھے اور
وہ بھی باپ سے زیادہ والد مرحوم کو اپنا مربی سمجھتے تھے، آج بھی مطبع نامی
کے پرنٹر منشی لالہ بانکے لال صاحب سکنہ ہنجرو ۳۸ اڑتیس سال کے ملازم ہیں
اور پریس کے کام کو اپنا کام سمجھکر کرتے ہیں۔

والد کے احباب خاص اور مربیوں میں بھی کافی تعداد ہندوؤں کی تھی
جن میں اب صرف مکرمی بابو بھیروں پرشاد صاحب وکیل و مکرمی بابو سالک رام
صاحب وکیل باقی ہیں خدا ان کو عرصۂ دراز تک زندہ رکھے،

والد سنی مسلمان تھے لیکن شیعوں کے ساتھ انکو کبھی مغائرت نہیں رہی
اور انہوں نے ہمیشہ اس کا خیال رکھا کہ شیعہ صاحبان کو کبھی کوئی موقع

شکایت کا نہ ملے، مطبع میں بہت سے شیعہ ملازم رہے اور بیش قرار تنخواہوں اور ذمہ داری کے کاموں پر رہے اور وہ سب ہمیشہ والد کی رواداری سے خوش رہے، شیعہ سنیوں کے جھگڑے کے زمانہ میں والد مرحوم نے کوئی کتاب پریس سے ایسی شائع نہیں کی جس سے کسی کی دل آزاری ہو حالانکہ اس زمانہ میں ایسی کتابوں کی بہت بکری ہوتی تھی، مناظرہ کی کتابیں بھی والد اپنے پریس میں نہیں چھاپتے تھے، اور ایسے اشتہارات بھی واپس کر دیتے تھے جن سے کسی فریق کی دل آزاری مقصود ہو، انکا قول تھا ؎

مباش درپے آزار وہرچہ خواہی کن که در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

والد مرحوم نے جو بالطبع نہایت صلح جو اور امن پسند تھے اپنی تمام عمر میں کبھی کوئی حصہ مذہبی جھگڑوں اور لڑائیوں میں نہیں لیا، اور جب کبھی شہر کی فضا خراب ہوتی تھی تو وہ کوشش کرتے تھے کہ فضا درست ہو جائے۔

صفائی معاملات وہ معاملات کے بہت صاف تھے اور کاروبار میں انہوں نے جو ترقی کی اس کا یہ بھی ایک راز تھا ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو تمام ملازمین کی تنخواہ ضرور بانٹ دیتے تھے، قرض لینے سے بہت گھبراتے تھے اور اگر کبھی قرض ہو جاتا تو جلد اس کی ادائگی کی فکر کرتے، حسابات کے رجسٹر بہت مرتب رکھتے، اور جس سے جو رقم لیتے یا جس کو جو رقم دیتے وہ فوراً درج رجسٹر کرا دیتے انکی دیانت وصفائی معاملات تمام اہل مطابع وتاجران کتب میں مسلم تھی، اور لوگوں کو ان پر اور ان کے حسابات پر کامل اعتماد رہتا تھا،

دور اندیشی والد مرحوم کو دنیا کے معاملات کا بہت تجربہ تھا اور وہ زمانہ کے سیکڑوں نشیب وفراز دیکھے ہوئے تھے اس تجربہ کے ساتھ خدا نے ان کو

طبع سلیم اور فکر مستقیم عطا کی تھی، اور وہ سونچنے اور غور کرنے کے عادی ہو گئے تھے، اکثر شب کو جاگا کرتے اور اہم معاملات سونچا کرتے، یوں بھی جب کوئی بات منھ سے نکالتے تو بہت سوچ سمجھکر نکالتے اور سائل کی بات کا اس وقت تک جواب نہ دیتے جب تک مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور نہ کرلیتے، دور اندیشی کا یہ عالم تھا کہ آئندہ پیش آنے والے واقعات اور ان کے نتائج بہت پہلے سے سمجھ لیتے تھے اور انکے لئے تیاری کرلیتے تھے، ذاتی معاملات کے متعلق انھوں نے خوب سونچ سمجھ کر ہر بات کی تیاری کرلی تھی، پہلے ۱۸۹۱ء میں ایک وصیت نامہ لکھا تھا جس کو ایک مدت گذرنے کے بعد منسوخ کردیا پھر ۱۹۱۰ء میں دوسرا وصیت نامہ تحریر کیا، پھر تغیر حالات کی بناء پر اس کو بھی منسوخ کردیا اور ۱۹۲۴ء میں اپنے ورثا کے باہمی مشورہ ورضامندی سے تیسرا وصیت نامہ تحریر فرمایا اور اس پر اپنے ورثا سے منظوری کے دستخط کرائے، جس کو بتاریخ ۳۰ر اپریل ۱۹۳۵ء ان کے ورثا نے بعد انکی وفات کے بھی منظور اور نافذ العمل کر کے اپنے دستخط کردیے،

والد مرحوم کی یہ دور اندیشی اس لئے تھی کہ وہ اپنے بعد اپنے ورثا میں کامل اتحاد و یکجہتی قائم رکھنا چاہتے تھے اور اس کی انکو بڑی فکر تھی اور انھوں نے خاص طور سے اسکے لئے کوشش کی تھی جو الحمدللہ کہ کامیاب ہوئی۔

اسی طرح سیکڑوں معاملات میں ان کی دور اندیشی نے بڑے بڑے کام کئے ہیں جن کا اظہار طوالت سے خالی نہ ہوگا۔

باب چہارم

مذہبی و قومی خدمات، بنائے مساجد و اعانت مدارس، قومی مجالس میں شرکت، ترکوں سے محبت، جنگ پلونا میں ترکوں سے ہمدردی، فتح تھسلی (جنگ روم و یونان ۱۸۹۷ء) پر لکھنؤ میں جشن عظیم کا سامان کرنا اور مجلس حمیدیہ قائم کرنا، حجاز ریلوے فنڈ میں چندہ جمع کرنا، جنگ طرابلس و بلقان و محاربۂ عظیم میں ترکی مجروحین و مظلومین کی امداد کے لئے کوشش کرنا، اصلاح ذات البین کرنا اور پنچایتوں سے باہمی نزاعات کا طے کرنا،

مذہبی و قومی خدمات والد مرحوم نے اپنی سوانح عمری میں اپنے مذہبی و قومی خدمات کا کہیں پر اشارتاً بھی کوئی ذکر نہیں کیا ہے اور نہ ان کو ظاہر کرنا پسند کرتے تھے، ان کے ہمعصروں اور ہم سنوں میں بھی اس وقت کوئی باقی نہیں ہے جس سے کچھ پتہ چل سکے، ان کے بہت سے کارنامے ہماری پیدائش یا سن شعور پر پہنچنے سے پہلے کے ہیں جن سے ہم لاعلم ہیں، اب جو کچھ ہم تحریر کریں گے ان کی بنا، یا تو ہمارے ذاتی علم و مشاہدہ پر ہوگی یا بعض روایات صحیح ہونگی جو معتبر اصحاب سے ہم کو پہنچیں، یا کاغذات اور تحریروں کا وہ ریکارڈ ہوگا جو والد مرحوم چھوڑ گئے ہیں اور جن سے بعض واقعات کا پتہ چلتا ہے، ان کے قومی و مذہبی کاموں کے کرنے کا وہ طریقہ نہ تھا جیسا آج کل رائج ہے کہ نمائش تو بہت ہوتی ہے اور

کام تھوڑا ہوتا ہے اور کام کرنے والے ذرا بھی لوگوں کی نکتہ چینی کو برداشت نہیں کر سکتے، اور کاموں سے دستکش ہو جاتے ہیں اگلے بزرگوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مذہبی اور قومی کام خالصاً لوجہ اللہ کرتے تھے، اور جہاں تک ہوتا تھا نمائش اور اظہار سے بچتے تھے، نکتہ چینی اور عیب گیری ان کو کام سے بددل اور شکستہ خاطر نہ کرتی اسی لئے وہ بڑے بڑے کام کر گئے جو آج ہم لوگوں سے نہیں ہو سکتے،

میں والد مرحوم کے قومی و مذہبی کاموں سے بہت کم واقف ہوں پھر بھی جو کچھ مجھکو معلوم ہیں وہ اس قدر شاندار اور زبردست ہیں کہ زمانۂ حال کے بڑے بڑے باا ثر لیڈر ویسے کام نہیں کر سکتے سبب یہ ہے کہ جتنا مذہبی جوش اور قومی درد ان کے دل میں تھا وہ اس زمانہ میں بہت کم لوگوں کے دلوں میں پایا جاتا ہے،

بنائے مساجد و اعانت مدارس

جیل کی ملازمت کے زمانہ میں سنٹرل جیل کے سامنے والد مرحوم نے اپنی کوشش سے ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی تھی، میں نے اس کو جا کر دیکھا ہے اور اس میں نماز بھی پڑھی ہے مسجد آباد اور پر رونق ہے، اور کافی وسیع ہے۔ خواجہ فتح اللہ کی ہراول واقع سرائے معالیخاں میں والد مرحوم نے ایک مسجد خالص اپنے صرف سے بنوائی تھی جو آج کل نمازیوں کے نہ ہونے کے سبب سے ویران رہتی ہے، مسجد شیخان۔ کٹرہ ابو تراب خاں کی سب سے قدیم مسجد ہے، والد مرحوم کسی وقت میں وہاں تراویح بھی سنایا کرتے تھے اور آخر عمر میں نماز جمعہ اسی میں ادا کرتے تھے اس مسجد کو انھوں نے کئی بار منہدم ہونے سے بچایا اور مرمت کرائی

اس کے علاوہ سعادت گنج میں بھی کوئی مسجد بنوائی تھی مگر یاد نہیں
کہ کہاں پر ہے اور کونسی ہے، مسجد عید گاہ کی تعمیر میں بھی انہوں
نے کافی حصہ لیا تھا، اور جب کبھی کسی مسجد کے لئے کوئی شخص چندہ
لینے آتا تھا ضرور کچھ نہ کچھ دیتے تھے، مدارس میں مدرسہ رفاہ المسلمین
جس کو استاذی مولانا فتح محمد صاحب تائب نے قائم کیا تھا اس کے
اولین ارکان و معاونین میں والد مرحوم بھی تھے اور مرتے دم تک
اس میں چندہ دیتے رہے، ندوۃ العلماء کے کاموں میں بھی ہمیشہ
سرگرمی سے حصّہ لیا، اور منشی اطہر علی صاحب مرحوم اور مولانا شبلیؒ
کو جب ضرورت ہوتی تھی والد مرحوم سے مدد لیتے تھے، ندوۃ العلماء
کے سالانہ جلسے جب لکھنؤ میں ہوتے تھے تو مہمانوں کے کھانے پینے
کا انتظام اکثر ان کے سپرد ہوتا تھا اور وہ اس قدر انہماک سے
کام کرتے تھے کہ تین تین چار چار روز تک گھر جانا نصیب نہ ہوتا تھا
مجھے یاد ہے کہ سنہ ۱۹۱۵ء میں جب ندوہ کا چودھواں اجلاس لکھنؤ میں
ہوا ہے، تو اس کے بہت سے انتظام والد کے سپرد تھے اور
میں نے ان کو بیحد دلچسپی سے کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

بہت سے مدارس کی امداد کتابوں سے کرتے تھے، دہلی کے
کسی مدرسہ کے متعلق فرماتے تھے کہ میں نے تمہاری ولادت سے
پہلے ایک پورا کتب خانہ قدیم اور نادر کتابوں کا اس کو دے
دیا تھا، مدرسہ عالیہ نظامیہ کو ایک بار بخاری شریف کے متعدد
نسخے خرید کر دے دیے تھے،

قومی مجالس میں شرکت | آج کل کے لوگوں کی طرح والد کو مجلس سازی

یا انجمنوں میں نمائشی حصّہ لینے کا شوق نہ تھا، لیکن اگر ان سے کسی انجمن میں شرکت کے واسطے کہا جاتا تو وہ بخوشی شریک ہو جاتے اور جس طرح بن پڑتا اُس کا کام کرتے اور جو ماہوار چندہ مقرر کر دیتے اُس کو کبھی ناغہ نہ فرماتے، اُنکے ذمہ کبھی کسی انجمن کا چندہ باقی نہیں رہا، وہ متعدد انجمنوں کے رکن رہے، انجمن اصلاح المسلمین کے شروع سے ممبر رہے اور جب تک کام کرنے کے قابل رہے مجلس انتظامیہ کے بھی ممبر رہے، وہ انجمنوں کے جلسوں میں نہایت پابندی سے جاتے تھے، جو رائے ہوتی تھی صاف ظاہر کر دیتے تھے، مگر کسی سے بحثتے یا جھگڑتے نہ تھے اور اگر کوئی ان کی رائے سے اختلاف کرتا تھا تو بُرا نہ مانتے تھے،

مولانا فتح محمد صاحب رح کی ایک تحریر سے جو انکے محفوظات میں نکلی ہے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت اسلام کے امین تھے اور اسکے آغاز قیام سے ۱۳۱۶ھ تک امین رہے مولانا نے اس خط میں منجانب جماعت مذکورہ، والد کے خدمات کا اعتراف کیا ہے اور بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے،

ترکوں سے محبت | والد کو ترکوں سے بیحد محبت اور سلطان عبد الحمید خان مرحوم سے انتہائی عقیدت تھی وہ انکو ناموس اسلام کا محافظ اور لوائے خلافت کا حامل سمجھتے تھے، ہندوستان میں جب پہلے پہل ترکی ٹوپی آئی ہے تو عام مسلمان اس کو کراہت کی نظر سے دیکھتے تھے اور نیچریوں کی ٹوپی کہتے تھے، والد مرحوم نے جب اس کو دیکھا اور یہ معلوم ہوا کہ ترک ایسی ہی ٹوپی پہنتے ہیں تو انہوں نے قدیم

شرفائے لکھنؤ کی گول ٹوپی کو چھوڑ کر اس کو پہننا شروع کر دیا اور لومتہ لائم کی پروانہ کی، اور پھر عمر بھر اس کو نہ چھوڑا،
ترکی ٹوپی انکو اس درجہ محبوب تھی کہ بازار سے بہت سی ٹوپیاں خرید کر لاتے تھے اور لوگوں کو مفت بانٹتے تھے اور کوئی پہن لیتا تھا تو بہت خوش ہوتے تھے،
عم مکرم حافظ شیخ محمد ابراہیم صاحب دام ظلہ سے بیحد محبت تھی ان کو ایک ٹوپی کانپور بھیجی جب وہ والد کے پاس لکھنؤ آتے تھے تو وہی ٹوپی پہن کر آتے تھے لیکن کانپور میں بہت کم استعمال کرتے تھے کہ اُس وقت ایک عجوبہ چیز سمجھی جاتی تھی اور جو اس کو پہنتا تھا وہ لوگوں میں انگشت نما بن جاتا تھا،
انہوں نے ترکوں کا وہ وقت بھی دیکھا تھا کہ جنگ بلونا سے پہلے تین براعظموں پر ان کی عظیم الشان حکومت پھیلی ہوئی تھی، پھر وہ زمانہ بھی دیکھا کہ جنگ عظیم کے بعد ترکی کے حصے بخرے ہو گئے اور آخر میں خلافت کا نام بھی مٹ گیا، ان انقلابات کا جو اثر ان پر ہوتا تھا وہ بیان سے باہر ہے، اور ہم اس کو آگے چل کر بیان کریں گے،

حج سے واپس آئے ہیں تو چند ترکی سکے، ترکی ٹکٹ اور ترکی کی بنی ہوئی چیزیں ہمراہ لائے تھے ان کو بہت حفاظت سے رکھ چھوڑا تھا اور کبھی کبھی نکال اس نظر سے دیکھا کرتے تھے کہ گویا بہت محبوب چیزیں ہیں،
سلطانی طغرے کی نقل بنوایا کرتے تھے کشمیر سے اپنی ادر

ہم لوگوں کی مہریں کھدوائیں تو اسی طغرے میں کھدوائیں، تاج عثمانیہ کی نقل اور ہلال کی شکل اکثر کتابوں پر چھپواتے تھے، خطبوں میں سلطان عبدالحمید خاں کا نام چھپوا دیا تھا اور ہر نماز کے بعد سلطان کے واسطے دعا کیا کرتے تھے،

بہت بچپن کی بات ہے لیکن یاد ہے کہ والد مرحوم کی تاکید تھی کہ جب صبح کو سو کر اٹھا کرو تو سب سے پہلے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگا کرو کہ یا اللہ سلطان کی خیر!

جنگ پلیونا میں ترکوں سے ہمدردی

جنگ پلیونا کو بہت زمانہ گذر گیا، اُس وقت ہندوستان کے مسلمانوں میں ترکوں کی ہمدردی کا اُس درجہ پر احساس نہ تھا جو بعد کو پیدا ہوا، لیکن والد مرحوم ذکر کیا کرتے تھے کہ فرنگی محل میں ترکی مجروحین کی امداد کے لئے کوئی مجلس قائم ہوئی تھی جو چندہ جمع کرتی تھی اور وہ بھی اس میں شریک تھے اور بقدر امکان مستعدی سے حصّہ لیتے تھے مگر ہمارے پاس اس کا کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں ہے،

فتح تھسلی (جنگ روم ویونان ۱۸۹۷ء) پر لکھنؤ میں جشن عظیم کا سامان کرنا اور مجلس حمیدیہ قائم کرنا

پلیونا میں ترکوں کی شکست نے مسلمانان عالم کو سخت شکستہ دل و افسردہ خاطر کر دیا تھا، ۱۸۹۷ء میں ترکوں کی یونان سے جنگ ہوئی اور خلاف توقع ترکوں نے حیرت انگیز غلبہ حاصل کیا، جس سے مسلمانوں میں غیر معمولی جوش مسرت پیدا ہو گیا اور ان کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، اور مقامات کا حال ہمیں معلوم نہیں، لیکن لکھنؤ کے مسلمانوں نے اس موقع پر بہت بڑا

جشن مسرت منایا تھا اور سلطان المعظم سے اپنی گہری عقیدت کا اظہار کیا تھا، میری عمر اس وقت چار سال کی تھی لیکن بعض اوقات بہت بچپن کی باتیں خصوصاً وہ کہ نزاکتاً اہم ہوتی ہیں خوب یاد رہ جاتی ہیں مجھے وہ جشن اور وہ جلسۂ مسرت آج تک یاد ہے، اور اس کے جزئی واقعات تک میرے حافظہ میں موجود ہیں اور میں اس میں شریک بھی ہوا تھا،

یوں تو شہر کے تمام مسلمانوں نے پورے جوش و خروش کے ساتھ اس تحریک میں حصّہ لیا تھا لیکن والد مرحوم سب سے زیادہ نمایاں حصّہ لے رہے تھے اور ممکن ہے کہ اس کا خیال سب سے پہلے انہیں کے دل میں پیدا ہوا ہو، مسلمانانِ لکھنؤ نے مجلس حمیدیہ کے نام سے ایک انجمن اس کے لئے بنائی تھی اور والد کو اس کا ناظم مقرر کیا تھا، ۱۸ر جولائی ۱۸۹۷ء کو بمقام عیدگاہ ایک عظیم الشان جلسۂ مسرت کیا گیا تھا جس میں تقریریں ہوئی تھیں، ریزولیوشن پاس ہوئے تھے، میلاد شریف ہوا تھا جو مولانا ہادی علی خاں صاحب مرحوم نے بیان کیا تھا، اور غربا کو غلّہ بھی تقسیم کیا گیا تھا مجھے یاد ہے کہ اس جشن کی تیاریاں بہت ہی عظیم الشان پیمانہ پر کی گئی تھیں جلسہ گاہ کو بیشمار ہلالی جھنڈیوں سے آراستہ کیا گیا تھا، اور ہر قسم کی آرائش و زیبائش بدرجۂ کمال کی گئی تھی، اور مسلمانوں کا بیشمار مجمع اس میں شریک ہوا تھا، میرے نزدیک مسلمانانِ لکھنؤ کا کوئی جشن مسرت اس سے بڑھ کر عظیم الشان کبھی نہیں ہوا اور جن لوگوں نے آنکھوں سے دیکھا تھا وہ آجتک اس کو نہ بھولے ہونگے،

حلبہ کی طرف سے سلطان المعظم کو تار بھی دیا گیا تھا، استاد مرحوم حضرت خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز نے تہنیت نامہ نظم فرمایا تھا جس کا مطلع یہ تھا ؎

اے طراز لشکرت از نصرت فتح مبیں
رایت انا فتحنا آیت فتح مبیں

اور آخری دعائیہ شعر حسب ذیل تھا ؎

چتر مہرت تیغ قہرت سایہ گستر بر جہاں
آن بفرق مسلمین و ایں بفرق مشرکیں

یہ تہنیت نامہ کتاب کی صورت میں بہترین کاغذ پر اس زمانہ کے سب کے بہتر کاتب منشی شمس الدین اعجاز رقم مرحوم سے لکھوا کر مطلا و مذہب کرایا گیا تھا اور دوسرا تہنیت نامہ بصورت عرضی، عربی نثر میں مولانا محمد طیب عرب مرحوم سے لکھوا کر اس زمانہ کے بہترین نسخ نویس جو صاحب سے اعلیٰ ترین کاغذ پر تحریر کرا کے نفیس طلائی بیل بوٹوں سے مزین کرایا گیا تھا،

یہ دونوں تہنیت نامے عربی و فارسی کے مسلمانان لکھنؤ کی جانب سے سلطان المعظم کی خدمت میں ارسال کرنے کے لئے تیار کئے گئے تھے لیکن افسوس کہ برٹش گورنمنٹ نے انکے بھیجنے کی اجازت نہ دی، کیونکہ وہ یونانیوں سے ہمدردی رکھتی تھی، اور مسلمانوں کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔ یہ دونوں یادگار چیزیں والد صاحب کے پاس محفوظ رہیں اور آجتک موجود ہیں (مجلس حمیدیہ سے انہوں نے قیمتاً خرید لی تھیں اور غالباً رسید بھی کہیں رکھی ہے) اس جشن کے متعلق کل کاغذات مطبوعہ و غیر مطبوعہ رسیدات، حسابات، خطوط و اشتہارات والد صاحب نے بہت حفاظت سے اپنے پاس رکھے،

میں نے انکو حال میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس جشن کے تمام ترروح رواں وہی تھے اور بڑی سرگرمی اور دلچسپی سے انہوں نے یہ کام انجام دیا تھا،

حجاز ریلوے فنڈ میں چندہ جمع کرنا

۱۹۰۸ء میں سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے حجاز ریلوے جاری کرنے کے لئے جب مسلمانان عالم سے چندہ کی اپیل کی تو ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی مذہبی کام سمجھکر اس میں بہت شوق سے حصہ لیا، مولوی انشاء اللہ خاں مرحوم اڈیٹر وطن لاہور نے اس کے جمع کرنے اور بھیجنے کا بہت اچھا انتظام کیا تھا اور عام مسلمان انہیں کے وساطت سے بھیجتے تھے، والد مرحوم نے بھی چندہ جمع کرنا شروع کیا، خود بھی برابر دیتے تھے اور دوسروں سے بھی وصول کرتے تھے اور وطن لاہور کو روانہ کر دیتے تھے،

کچھ عرصہ کے بعد سلطان المعظم نے ایک چاندی کا تمغہ اور ایک فرمان قطب الدین شمس الدین کے نام سے ارسال فرمایا، پھر ایک مدّت کے بعد دوسرا نقرئی تمغہ مع فرمان قطب الدین قمر الدین کے نام سے مرحمت فرمایا، یہ دونوں تمغے اور فرمان آج تک محفوظ ہیں، چندہ حجاز ریلوے کی بہت سی رسیدیں بھی موجود ہیں۔

جنگ طرابلس وبلقان و محاربہ عظیم میں ترکی مجروحین ومظلومین کی امداد کے لئے کوشش کرنا

۱۹۱۱ء میں جنگ طرابلس شروع ہوئی، جب کہ اٹلی نے صرف ہوس ملک گیری میں طرابلس الغرب پر حملہ کر دیا، اور وہاں کے باشندوں پر بلاے ناگہانی کی طرح نازل ہو گئی ہندوستان کے مسلمان، جو ترکوں اور طرابلس کے مظلوم عربوں سے گہری ہمدردی رکھتے تھے اپنی بے بسی و بے

کے سبب سے اور تو کچھ نہ کر سکے، البتہ اتنا ضرور کیا کہ جلسے کر کے اٹلی کی قابل نفرت حرکات پر صدا ہائے احتجاج بلند کرتے رہے اور مجروحین کی امداد کے لئے چندے جمع کر کے بھیجتے رہے، لکھنؤ میں مجلس موئید الاسلام نے جس کو علمائے فرنگی محل نے اس مقصد سے قائم کیا تھا اور جس نے جنگ بلونا میں بھی ترکوں کے لئے چندے فراہم کئے تھے اس موقع پر بڑے جوش اور مستعدی سے کام کیا، اور نہ صرف لکھنؤ بلکہ صوبۂ اودھ میں مسلمانوں کو ترکوں اور عربوں کی مالی امداد پر آمادہ کر دیا، والد مرحوم ایسے موقع پر کب خاموش بیٹھ سکتے تھے، اُٹھ کھڑے ہوئے، اور ہر چند کہ انکے قویٰ ضعیف ہو چکے تھے لیکن انتہائی جوش کے ساتھ فراہمی چندہ کا کام جاری کر دیا اور ہزاروں روپے جمع کر کے انجمن موئید الاسلام اور انجمن ہلال احمر کو حوالہ کر دیے، جنگ طرابلس ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ بلقان کی ریاستوں نے متحد ہو کر ترکی پر حملہ کر دیا، ترکوں نے مجبور ہو کر اٹلی سے صلح کر لی اور بلقانیوں سے مقابلہ شروع کر دیا، اس وقت مسلمانانِ عالم کی توجہ، کارزارِ طرابلس سے ہٹ کر جنگ بلقان کی طرف پھر گئی، خلاف اُمید ترکوں کو شکستوں پر شکستیں ہونے لگیں اور بلقانیوں کے مظالم سے غریب مسلم رعایا شدید مصائب میں مبتلا ہو گئی، اس وقت مسلمانانِ عالم کے اضطراب و مایوسی کی کوئی انتہا باقی نہ تھی، ہندوستان کے بے بس مسلمان روپیہ پیسہ کی امداد دینے کے سوا اور ہی کیا سکتے تھے، جو کچھ ان کے امکان میں تھا انہوں نے خوب فیاضی سے دیا، اور کوئی کوتاہی نہیں کی، والد مرحوم کا یہ حال تھا کہ پیہم شکست کی خبروں نے ان کو بیحد

افسردہ خاطر اور ملول کر دیا تھا، بلقانی مظالم کے واقعات سن سن کر بے تاب و بے قرار ہو جاتے تھے اکثر اوقات رویا کرتے تھے، اور روز و شب خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے،

جب کہیں ذکر آجاتا تھا آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے تھے راتوں کی نیند اُڑ گئی تھی، کھانا پینا تک چھوٹ جاتا تھا، شب و روز چندہ کی فراہمی کے سوا کوئی کام نہ تھا، صبح سویرے سے نکل جاتے تھے اور ایک ایک غریب و امیر کے سامنے جاکر ہاتھ پھیلاتے تھے اور ترکوں کی مصیبت رو رو کر بیان کرتے تھے اور چندہ مانگتے تھے، وہ چندہ اس طرح مانگتے تھے کہ سنگدل سے سنگدل بھی دینے سے انکار نہ کر سکتا تھا، لوگوں کے یہاں شادی یا تقریب کے موقع پر بلائے جاتے تھے تو بغیر چندہ لئے واپس نہ آتے تھے، محافل میلاد میں پہنچتے تھے تو چندہ کی فکر سے غافل نہ رہتے تھے، اور زیادہ مجمع دیکھتے تو ذہن یار و بال پھیلا کر مانگنا شروع کر دیتے، کسی کے یہاں غمی ہوتی اور تعزیت کو جاتے تو ایصال ثواب کے لئے چندہ کی اپیل کرتے، اتوار کے دن نخاس میں بازار لگتا ہے وہاں سویرے سے پہنچ جاتے اور ایک ایک دکاندار کے آگے ہاتھ پھیلا کر چندہ مانگتے اور جو رقم جمع ہو جاتی اُس کو گھر پر آکر جوڑتے اور پھر اتنی ہی رقم اپنے پاس سے ملا دیتے تھے، جو چندہ جمع کرتے اُس کو اپنے پاس نہ رکھتے فرنگی محل جا کر دے آتے، خود اپنے پاس سے وقتاً فوقتاً بڑی بڑی رقمیں دے دیتے تھے، ذاتی مصارف میں کمی کر دی تھی، دودھ جو ہمیشہ سے مرغوب تھا بند کر دیا تھا، کھانے میں تخفیف کر دی تھی، کپڑا بنانا موقوف

کر دیا تھا اور جو رقم پس انداز ہوتی تھی چندہ میں دے دیا کرتے تھے،
افسردگی اور حزن و ملال کا یہ حال تھا کہ ہنسی اور مسکراہٹ چہرے پر
نہ آتی تھی، ہم لوگوں کو ہنستے ہوئے دیکھتے تھے تو ناراض ہو کر کہتے تھے کہ
کیا تم کو اس کی خبر نہیں ہے کہ آج ترکی کے مسلمانوں پر کیا گذر رہی ہے
یہ خوشی کا وقت ہے یا رونے کا ہے۔ ایک روز جوش اضطراب میں میرا
ہاتھ پکڑا اور دعا کی کہ اے اللہ تو خوب جانتا ہے کہ دنیا میں مجھکو اس
لڑکے سے زیادہ کوئی چیز عزیز اور محبوب نہیں ہے اگر اس کے
کام میں آجانے سے مسلمانوں کی مصیبت ٹل جائے اور ان کی عزت رہ
جائے تو میں بہت خوشی سے اسکو تیری راہ میں پیش کرتا ہوں تو اس
فدیہ کو اور میری ناچیز نذر کو قبول کرلے،

لوگ ان کی بے قراری کو دیکھ کر سمجھایا کرتے تھے کہ خدا کی رحمت
سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ آخر میں مسلمانوں کی فتح ہو جائے
مگر ان کے دل کو اطمینان نہ ہوتا تھا۔ ترکوں کی شکستوں کا رات دن
اس قدر غم کرتے تھے کہ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اس غم میں ہلاک
نہ ہو جائیں۔

میں اُس زمانہ میں روز شام کے وقت انگریزی اخبار پڑھنے کے
لئے لائبریری جایا کرتا تھا کہ اس سے خبریں جلد معلوم ہو جاتی تھیں
فرماتے تھے کہ جس دن لائبریری سے ترکوں کی فتح کی خبر لاکر سناؤ گے
۵ر انعام دونگا،

غرضکہ جنگ بلقان کا سارا زمانہ اسی اضطراب میں ان پر کٹا
یہانتک کہ صلح ہوگئی اور جس طرح ورثا مردہ کو رو پیٹ کر بیٹھ رہتے

ہیں اور صبر آجاتا ہے اسی طرح وہ بھی صبر کرکے بیٹھ رہے،
اُسی زمانہ میں مسجد کانپور کا واقعہ بھی پیش آیا تھا اور رسیدوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے لئے بھی فراہمی چندہ کی مرحوم نے بہت کوشش کی تھی،

ان واقعات کے بعد چند ہی سال امن وسکون سے گذرنے پائے تھے کہ یورپ کی جنگ عظیم شروع ہوگئی، اس جنگ سے ان کو کوئی دلچسپی نہ تھی یہانتک کہ بدقسمتی سے ترک بھی میدان میں پھاند پڑے، اور جنگ کی نوعیت انکی نظر میں بدل گئی، مسلمانوں کی بدنصیبی سے انکو شروع سے یقین تھا کہ ترک اس جنگ میں بالکل تباہ ہوجائیں گے اور جو کچھ رہا سہا ملک ہے وہ بھی ہاتھ سے نکل جائیگا، تاہم وہ صبر وسکون کے ساتھ دیکھتے رہے، جرمن وآسٹریا کی شرکت واتحاد سے کبھی کبھی یہ اُمید موہوم ہوجاتی تھی کہ شاید ترکوں کو کچھ نفع پہنچ جائے، درۂ دانیال کی زبردست مدافعت اور قط العمارہ پر انگریزوں کی شکست سے اس اُمید کو بہت کچھ تقویت ہوگئی تھی،
خلافت کے تحفظ اور ترکی مجروحین کی امداد کے لئے مسلمانان ہند نے مجلس خلافت کی بنیاد رکھی تھی اور ہر مقام پر خلافت کمیٹیاں قائم ہوگئی تھیں، والد مرحوم کی ترکوں کی امداد میں یہ آخری مگر سب سے زبردست خدمت تھی کہ انہوں نے مسلسل چار سال تک (سنہ ۱۹۲۰ء لغایت سنہ ۱۹۲۳ء) ترکی مجروحین، بیوگان ویتامی کی اعانت کے لئے اپنی سابقہ سرگرمیوں سے زائد سرگرمی کے ساتھ چندے فراہم کئے اور اودھ خلافت کمیٹی کو مدد دی، باوجود پیرانہ سالی وضعف قوی کے وہ حیرت انگیز مستعدی سے

کام کرتے رہے جس کی شہادت میں رسیدوں کے بڑے بڑے بنڈل موجود ہیں، صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا لیکن میرے اندازہ میں محاربہ طرابلس بلقان اور جنگ عظیم میں ان کے ذاتی اور دوسروں سے وصول شدہ چندوں کی مجموعی رقم ایک لاکھ روپیہ سے زائد ہوگی،

تھوڑا زمانہ ہوا کہ ایک مرتبہ حضرت قطب میاں صاحب قبلہ سے فرماتے تھے کہ میں نے ترکوں کے لئے جو چندہ دیا یا فراہم کیا اس کی رسیدوں کا ایک بڑا ذخیرہ میں نے اپنے پاس حفاظت سے رکھ لیا ہے اگر خلاف شرع نہ ہوتا تو وصیت کر دیتا کہ ان کو میرے ساتھ قبر میں رکھ دیا جائے، اور تو کوئی نیکی کا کام میں نے کیا نہیں ہے شاید ان رسیدوں کو پیش کرنے سے خدا کے یہاں نجات کا سامان بہم پہنچ جائے۔

جنگ عظیم میں جیسا کہ ان کو خوف تھا رفتہ رفتہ ترکوں کی قسمت کا پانسہ پلٹتا گیا، یہانتک کہ بلاد عرب ہاتھ سے نکل گئے اور بیت المقدس نصاریٰ کے قبضہ میں آگیا۔

بیت المقدس کے ہاتھ سے نکل جانے کا ان کو اس قدر شدید رنج ہوا کہ اگر اسلام میں خودکشی جائز ہوتی تو یقیناً وہ اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے، کئی وقت کھانا نہ کھایا اور نہ کسی سے بات کی، صورت اسقدر غمزدہ تھی کہ دیکھی نہ جاتی تھی، اس قسم کے صدمے متواتر پہنچتے رہے یہانتک کہ ترکوں نے ہتھیار ڈالدیے اور جنگ کا خاتمہ ہوگیا، والد مرحوم نے کمال پیرانہ سالی میں یہ سخت صدمے اٹھائے جس سے انکی صحت بالکل جواب دے گئی اور تقریباً اسی زمانہ میں انکو ضیق النفس کے شدید دورے شروع ہوگئے اور خانہ نشین و عزلت گزین ہوگئے

اس کے بعد انہوں نے اخبار بینی بالکل ترک کر دی، اور ترکوں کو آخری مرتبہ رو پیٹ کر ایسے بیٹھے کہ پھر نہ اُٹھے،

اصلاح ذات البین کرنا اور پنچایتوں سے باہمی نزاعات کا طے کرنا

والد مرحوم میں ایک بڑی پاکیزہ صفت یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو آپس میں لڑنے سے روکتے تھے اور جہاں تک بس چلتا تھا بیچ میں پڑ کر مقدمات کا فیصلہ پنچایت سے کرا دیتے تھے، عام طور سے لوگوں کو ان کی عدالت و تقویٰ پر اس قدر اعتماد تھا کہ فریقین اُنہیں کو اپنا حکم مقرر کر دیتے تھے اور وہ بھی اپنے فرض کو اس قدر سچائی اور ایمانداری سے بلا رو رعایت پورا کرتے تھے کہ فریقین کو کوئی شکایت انسے نہ ہوتی تھی نہ پھر کسی کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت ہوتی تھی، وہ جہاں کہیں یہ سنتے تھے کہ انکے دو عزیزوں یا دوستوں میں جھگڑا ہے تو ہمیشہ اپنے کاموں کا حرج کر کے پہنچ جاتے تھے اور کوشش کر کے میل کرا دیتے تھے، انکی کوشش چونکہ بے غرض اور مخلصانہ ہوتی تھی اسلئے بہت کم ناکام رہتی تھی،

چھوٹے چھوٹے مناقشے اور معاملے تو ہزاروں طے کرائے، جن کا شمار نہیں ہو سکتا بڑے بڑے جھگڑے اور مقدمے جن میں دونوں فریق ذی حیثیت تھے اور جن کے طے کرنے میں والد کو بہت وقت صرف کرنا پڑا اور سخت دشواریاں پیش آئیں تعداد میں کم نہیں ہیں،

ہمارے معلومات اس باب میں بہت محدود ہیں، اور ہم صرف ان چند مقدمات کا ذکر کرتے ہیں جن کا ہم کو ذاتی علم ہے اور جو دا قعی مہتم بالشان تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے ہونگے جنکا ہمکو علم نہیں ہے۔

۱۹۰۴ء میں حاجی شیخ عبداللہ مرحوم مالک مطبع مجتبائی لکھنؤ اور منشی عبدالوحید صاحب کے مابین مقدمہ چلا، دونوں نے والد مرحوم کو پنچ بنایا اور انہوں نے جھگڑا طے کر دیا،

۱۹۰۵ء میں ہمارے خاندان کی ایک مخدومہ اور رئیسہ بدر النسا بیگم صاحبہ نے دفعۃً بمرض طاعون انتقال کیا انکا متروکہ دو لاکھ کے قریب تھا اور ان کے ورثا میں سخت اختلاف تھا والد مرحوم نے بہت کوشش کی کہ باہمی تصفیہ ہو جائے چنانچہ جملہ ورثا نے انکو اور حضرت خواجہ عزیز الدین صاحب مرحوم اور ایک تیسرے صاحب کو پنچ مقرر کیا اور ایک سال سے زائد زمانہ کی محنت کے بعد سب معاملات برضامندی طے ہو گئے۔

۱۹۰۸ء میں منشی شیخ فخر الدین صاحب مالک فخر المطابع اور حاجی محمد بشیر صاحب میں پریس کے متعلق مقدمہ بازی ہوئی آخر والد مرحوم پنچ بنائے گئے اور انہوں نے فیصلہ کر دیا،

۱۹۱۳ء میں مولوی مفتی محمد یوسف صاحب مرحوم مالک مطبع یوسفی فرنگی محل اور مولوی عبد الاحد صاحب مرحوم مالک مطبع مجتبائی دہلی میں مقدمہ بازی ہوئی دونوں بڑے آدمی تھے اور ان کے مابین تصفیہ کرا دینا آسان نہ تھا، والد مرحوم نے بڑی کوشش کی کہ تصفیہ ہو جائے اور اس کے لئے کئی بار دہلی گئے آخر ان کی کوشش بارآور ہوئی، فریقین نے ان کو حکم مقرر کیا اور انہوں نے تصفیہ کر دیا،

باب پنجم

تالیف وتراجم، شاعری، وفات، اولاد، مختصر حالات
راقم الحروف ابوالبرکات شمس الدین احمد (فرزند اکبر)
مختصر حالات ابوالخیرات خواجہ قمرالدین احمد صاحب (فرزند ثانی)

تالیف وتراجم| والد مرحوم نے متعدد کتابیں لکھیں اور فارسی کی اکثر درسی کتابوں کے ترجمے کئے اور چھپوائے، مگر وہ اپنا نام ظاہر کرنا پسند نہ کرتے تھے دوسروں کے نام سے منسوب کر دیتے تھے، ان کا طرز تحریر بہت سلیس اور صاف ہوتا تھا اور مطلب ومضمون کو بہت دلنشین پیرایہ میں ادا کرتے تھے، خورشید بہو ایک بہت عمدہ اخلاقی ناول ہے اور مقبول ہوکر کئی بار چھپ چکا ہے، وہ انہیں کا لکھا ہوا ہے جس کو ایک دوست کے نام سے منسوب کر دیا تھا۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ ہر شریف بہو بیٹیوں کو اس کا مطالعہ کرایا جائے۔ اوزان قطبیہ، یہ والد کی آخر عمر کی تالیف ہے جس کو کمال تحقیق سے انہوں نے لکھا ہے، اس میں جملہ اوزان مروجہ کا ذکر ہے اور اطبا کے لئے بہت کار آمد ہے (غیر مطبوع) جن فارسی درسی کتابوں کے انہوں نے ترجمے کئے انمیں گلستان مع فرہنگ، بوستاں مع فرہنگ، یوسف زلیخا، سکندر نامہ ہے۔

شاعری| انہوں نے اپنے تذکرہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے منشی امیر اللہ تسلیم مرحوم سے شاعری میں اصلاح لی تھی اور قطب تخلص کرتا تھا، لیکن انہوں نے کبھی کسی کو اپنا کلام نہیں سنایا اور نہ شائع کیا

شعر فہمی کا مذاق بہت اعلیٰ درجہ کا رکھتے تھے حال ہیں، انکے کاغذات کی ورق گردانی میں ایک بہت پرانی قلمی بیاض ہم کو دستیاب ہوئی ہے، جس میں فارسی اور اردو کی غزلیں ہیں اور سب میں قطب تخلص لکھا ہے، غالباً یہ غزلیں انہیں کی ہیں لیکن جب انہوں نے خود اپنا کلام کبھی شائع نہیں کیا تو ہم بھی مناسب نہیں سمجھتے کہ اس کو شائع کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ انکو مروجہ طرز شاعری سے نفرت تھی اور وہ رندانہ کلام کو داخل معصیت سمجھتے تھے، ایک بار میرے ماموں خواجہ محمد یوسف صاحب مرحوم نے چند غزلیں اصلاح کے لئے پیش کیں تو ان کو منع کیا کہ ایسی شاعری نہ کرو جو نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق ہو،

وفات سعدیا مرد نکو نام نمیرد ہرگز — مردہ آنست کہ نامش بہ نکوئی نبرند

والد مرحوم دائم المرض تھے اور پیدائش سے وفات تک ہمیشہ بیماریوں میں گھرے رہے، بچپن میں بہت سخت بیماریاں جھیلیں، اوائل شباب سے نزلہ کھانسی ہیں اب مبتلا ہوئے کہ یہ بیماریاں رفیق زندگی ہوگئیں، مزاج خلقی نہایت گرم وخشک تھا اور اسی لئے حرارت کم کرنے کو کسی طبیب نے بچپن میں کافور استعمال کرایا تھا جسکی برودت سے انصباب نزلہ اور کھانسی کی دوامی شکایت پیدا ہوگئی، ان کو سرد اشیا بھی نقصان کرتی تھیں اور گرم اشیا بھی، اول الذکر مزاج عارضی کو بڑھاتی تھیں اور ثانی الذکر مزاج خلقی کو، قوائے عقلیہ و دماغیہ نہایت سلیم اور اعلےٰ درجہ کے تھے مگر قوائے جسمانیہ ضعیف واقع ہوئے تھے، معدہ، جگر، اور امعا کے اکثر امراض

حاوث رہتے تھے، اسی لئے پرہیز واحتیاط انکے واسطے طبیعت ثانیہ
بن گئے تھے، اور ان کی غذا بہت سادی ہوتی تھی۔ دوا کا استعمال
ہمیشہ جاری رہتا تھا اور بمشکل کوئی زمانہ ایسا ہوتا تھا کہ وہ پورے
تندرست رہتے ہوں۔

۱۹۲۳ء کے بعد سے انکی صحت بہت بگڑ گئی تھی، اور شکایات
سخت لاحق ہونے لگی تھیں، تھوڑے زمانہ سے قلبی تکالیف نے بہت
پریشان اور صاحب فراش کر دیا تھا، شب و روز دو ملازم انکی خدمت
میں برابر حاضر رہتے تھے، والد مرحوم اپنی حالت کو خوب سمجھتے تھے
اور جانتے تھے کہ اب زیادہ زمانہ تک وہ زندہ نہیں رہ سکتے، انہوں
نے سفر آخرت کی ہر طرح تیاری کر رکھی تھی اور جسقدر ہدایتیں اور
وصیتیں ضروری سمجھتے تھے کر چکے تھے، بیس پچیس سال پہلے سے قبر کے
تختے خرید کر اور درست کرا کے رکھ لئے تھے، کفن جب حج سے لوٹ
کر آئے تھے تو وہاں سے متبرک کپڑے کا تیار کرا کے لائے تھے،
تمام ضروری کاغذوں کو لفافوں میں علیحدہ علیحدہ رکھ کر صندوق میں
بند کر دیا تھا، مصارف تجہیز و تکفین اور فاتحہ خیرات کے واسطے ایک
ہزار روپیہ نقد علیحدہ رکھ دیا تھا، اپنے تمام عزیزوں اور دوستوں
سے زبانی اور تحریری خطا و قصور معاف کرا لیا تھا، اب اگر کوئی فکر
تھی تو خاتمہ بخیر ہونے کی تھی اور اسی کی شب و روز خود دعا کرتے
تھے اور دوسروں سے اپنے حق میں دعا کراتے تھے، میں نے کسی کو
موت کے لئے اتنا آمادہ نہیں پایا جتنا ان کو پایا، لوگ موت کو
بھولے رہتے ہیں وہ سالہا سال سے موت کا ذکر برابر کیا کرتے تھے

یوں تو آغاز ماہ اپریل سے انکی صحت جلد جلد گرتی جا رہی تھی اور صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ہم بہت جلد انکے بابرکت سایہ سے محروم ہونے والے ہیں لیکن وسط اپریل سے حالت زیادہ تشویشناک ہو گئی تھی، ۲۴ر اپریل کو نسبتاً طبیعت اچھی تھی، ۲۵ر اپریل پنجشنبہ کو صبح کے وقت بیہوش پائے گئے، تین بجے تک اچھے تھے، اس کے بعد حسب حسب معمول ۴ بجے صبح کو آدمی نے پکار کر جگانا چاہا تو جواب نہ دیا اس نے مجھکو خبر دی میں نے جا کر دیکھا تو بیہوش تھے جس قدر تدابیر ممکن ہوے دو روز کیے گئے مگر افاقہ نہ ہوا اور ہوش نہ آیا، کبھی کبھی سانس کے ساتھ اللہ اللہ کی آواز نکلتے معلوم ہوتی تھی، آخر ۲۶ر اپریل ۱۹۳۵ء شب جمعہ کو ۹ بج کر ۲۰ منٹ پر ان کی روح پاک نے جسم خاکی اور عالم فانی کو چھوڑ کر خلد بریں کی راہ لی، انا للہ وانا الیہ راجعون ہ۔

حسب وصیت جناب مولانا مولوی حاجی محمد عبد الہادی صاحب فرنگی محلی نے بعد نماز فجر غسل دیا جس میں میرے ماموں جناب خواجہ وصی الدین صاحب (اسپیشل مجسٹریٹ) حکیم محمد ہادی رضا خاں صاحب ماہر اور بعض دیگر اعزا بھی شریک تھے، شب کو لوگوں کو خبر نہ ہو سکی، صبح کو اطلاع ہونے پر لوگ آنا شروع ہو گئے اور ۸ بجے تک بہت کافی مجمع ہو گیا، حضرت قطب میاں صاحب قبلہ سے والد مرحوم نماز پڑھانے کا وعدہ لے چکے تھے وہ باہر تشریف لے گئے تھے اور حسن اتفاق سے اسی وقت واپس آ گئے، ۸½ بجے مطب میں حضرت موصوف نے نماز جنازہ پڑھا دی، شرکا میں تمام علمائے فرنگی محل بھی موجود تھے، اور

تقریباً ۹ بجے مقبرۂ خواجہ محمد مقیم مرحوم میں جو ہمارے ہی محلہ میں واقع ہے، والدہ مرحومہ اور ہمشیرہ مرحومہ کے برابر تدفین ہوئی، اور سب نے دعائے مغفرت کی،

اللھم اغفرلی ولوالدی واعف عنھما وارحمھما کما ربیانی صغیراً

۲۸ اپریل کی صبح کو سیوم ہوا جس میں متعدد قرآن ختم ہو کر ایصال ثواب کیا گیا، ۳۰ اپریل کو استاذی جناب شیخ احسان الرحمٰن صاحب قدوائی بیرسٹر ایٹ لا و میونسپل کمشنر کی تحریک پر چیرمین صاحب میونسپل بورڈ لکھنؤ نے والد مرحوم کی وفات پر اظہار افسوس و تعزیت و ہمدردی کا ریزولیوشن بورڈ کے ایک جلسہ میں پیش کیا اور ممبران نے کھڑے ہو کر اس کو پاس کیا اور جلسہ کی کارروائی اظہار غم میں ملتوی کی گئی،

اولاد | والد مرحوم کے یہاں چودہ لڑکیاں اور تین لڑکے پیدا ہوئے جن میں سے دس لڑکیوں اور ایک لڑکے نے بزمانۂ رضاعت انتقال کیا، چار لڑکیاں سن رشد کو پہنچیں جن کے عقد کئے گئے، ان میں سے دو لڑکیوں کا والد کی زندگی ہی میں عرصہ ہوا انتقال ہو گیا،

وفات کے وقت دو لڑکیاں صدیقہ بیگم و زاہدہ بیگم اور دو لڑکے شمس الدین و قمر الدین چھوڑے،

میری دونوں بڑی بہنیں یعنے صدیقہ بیگم و زاہدہ بیگم، خدا ترسی و دینداری اور خوبی سرشت و نیک طینتی میں ہوبہو والد مرحوم کا نمونہ ہیں، ایسی فرشتہ خصال عورتیں بہت کم دنیا میں پائی جاتی ہیں، انھوں نے والد مرحوم کی بہت زیادہ خدمت و اطاعت کی اور وہ

ہمیشہ ان سے خوش رہے اور ان کے حق میں دعائیں کرتے رہے
ہم دونوں بھائیوں کو اولاد سے بڑھ کر سمجھتی ہیں، خدا انکے سایہ کو
مدت دراز تک ہمارے سروں پر قائم رکھے،

صدیقہ بیگم صاحبہ خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت کو منسوب ہیں
اور زاہدہ بیگم صاحبہ خواجہ غلام حیدر شاہ صاحب کو منسوب ہیں
خدا کے فضل سے یہ دونوں بہنوئی بھی نیکی اور شرافت کے پیکر مجسم
ہیں اور ہم دونوں بھائیوں پر اولاد کی طرح شفقت کرتے ہیں،

مختصر حالات راقم الحروف ابوالبرکات شمس الدین احمد فرزند اکبر

والد مرحوم کی سوانح عمری لکھ چکنے کے بعد بعض بزرگوں کا ارشاد ہوا کہ بزمرۂ اولاد آخر میں اپنے بھی مختصر حالات تحریر کروں، جس کی تعمیل توکرتا ہوں مگر شرم کے مارے قلم نہیں اٹھتا اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں اور کیونکر لکھوں، میرے پاس نہ نیکیوں اور بھلائیوں کا کوئی سرمایہ ہے نہ میرے سوانح حیات میں کوئی بات ذکر کرنے کے قابل ہے، یہ خدا کی قدرت ہے کہ وہ ذات جو سراپا حسنات اور پیکر برکات تھی دنیا سے اٹھ گئی اور مجھ الیاننگ اسلاف اس کی جانشینی کی مسند پر جگہ پاتا ہے ؎

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمۂ و ناز — بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

اب سنیے کہ والد مرحوم کے یہاں مسلسل بارہ لڑکیاں پیدا ہو چکی تھیں اور لڑکا کوئی نہ ہوتا تھا جس کی ان کو بڑی آرزو تھی اور جس کے لئے رات دن دعائیں مانگا کرتے تھے، خدا نے ان کو دولت بہت دی تھی اور کاروبار ترقی پر تھا مگر سب سے بڑا غم یہ تھا کہ کوئی لڑکا نہیں ہے جو وارث بنے اور کاروبار کو سنبھالے جب ان کی عمر چالیس سال سے متجاوز ہوئی تو یہ احقر انکے یہاں پیدا ہوا جس کی تاریخ ولادت ۵ر جنوری سنہ ۱۸۹۴ء مطابق ۲۷ر جمادی الثانی ۱۳۱۱ھ بروز جمعہ وقت صبح ہے، والدین، اعزا اقارب اور احباب کو اس کی ولادت سے کمال مسرت و شادمانی ہوئی اور بہت کچھ خوشی کا اظہار کیا گیا بہت سے شعراء نامدار نے ولادت کی تاریخیں کہیں، دو تاریخیں

نقل کرتا ہوں۔

تاریخ ولادت از خواجہ نور الدین صاحب مرحوم ؎

شد تولد ایں پسر چشم بد از وے دور باد — آنکہ رویش چہرہ با گلہا زرعنائی شدہ
خواجہ قطب الدین را حاصل ازیں فرخندہ نور — ہم سرور جان و دل ہم نور بینائی شدہ
زیں ولادت شادمان و خرم و خورسند و خوش — عاقل و لا یعقل و شہری و صحرائی شدہ
یافت رونق بزم عالم گشت خالی دل زغم — جام عشرت پر زدور چرخ مینائی شدہ
بہر تاریخ ولادت نو آسماں آمد ندا — نیر اوج شرف طالع ز بیائی شدہ ۱۳۱۱ھ

از منشی اشرف علی صاحب اشرفؔ مرحوم

خلفے داد حق بقطب الدین — رونق خاندان سعید زماں
گفت اشرف سن ولادت او — پسر نور عین راحت جان ۱۳۱۱ھ

والدین نے بڑے ناز و نعم سے پالا اور دادی، نانی، پھوپھیاں بہنیں ہر ساعت اس احقر کی خبر منایا کرتی تھیں، جب پانچ سال کی عمر ہوئی تو والد مرحوم نے بڑی دھوم دھام سے ختنہ کی تقریب کی اور غسل صحت کے موقع پر ہزارہا روپیہ صرف کیا اور تمام عزیزوں اور دوستوں کی پر تکلف دعوتیں کیں (مجھے اپنے ختنے کی تقریب آج تک یاد ہے) بہت سے شعرا نے تاریخیں کہیں، مولانا مولوی عبد العلی صاحب آسی مدراسی مرحوم والد کے بڑے دوست تھے انہوں نے ایک تاریخ نظم فرمائی جو درج ذیل ہے ؎

بعد حمد خدا و نعت نبی — بشنو ایں تازہ مژدہ دلخواہ
خلف سعد خواجہ قطب الدیں — گشت مختوں دریں مبارک ماہ
نام نامیش ہست شمس الدیں — طلعت شمس دینہ با لجاہ

ولہ لا مثیل فی الامثال | ولہ لا شبیہ فی الاشباہ

ایں چہ خوش سنتے ز ابراہیم | ایں چہ خوش خلعت از خلیل اللہ

بارک اللہ فی سعادتہ | و مع العلم دبہ البقاہ

حسن توفیق یار او باشد | ہم بود نصرت حقش ہمراہ

آتشی از بہر سال تاریخش | گفتم ایں سنت از خلیل اللہ ۱۳۱۵ھ

بروز غسل صحت جبکہ میری عمر چار سال، چار ماہ اور چار یوم کی تھی حسب رواج خاندانی بتاریخ ۲۷ر شوال ۱۳۱۵ھ بروز دوشنبہ بتقریب مکتب نشینی حضرت مولانا مولوی حاجی حافظ محمد عبدالوہاب صاحب فرنگی محلی سے بسم اللہ پڑھوائی گئی، اس تقریب کے موقع پر والد مرحوم نے اپنے تمام اعزا، احباب اور ملازمین و متعلقین کو شیرینی کے بڑے بڑے حصے بانٹے جس کا ذکر آج تک لوگوں سے سنتا ہوں (یہ تقریب بھی مجھے یاد ہے) انہوں نے مطبوعہ فہرست پر سب کے نام لکھکر ہر ایک کے گھر پر حصے بھیجے تھے جن میں ان کے ہندو احباب بھی بکثرت تھے، یہ فہرست آج تک محفوظ رکھی ہے اور میں نے اس کو پڑھا تو اس پر سقوں اور خاکروبوں تک کے نام لکھے ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بلا امتیاز چھوٹے بڑے کے سب کو مساوی نام بنام حصے بھیجے تھے،

اس تقریب کے ادا ہونے کے بعد حافظ حسن جان صاحب مرحوم میری تعلیم کے واسطے ملازم رکھے گئے حافظ صاحب مرحوم نے ایک ماہ سے کم مدت میں قواعد بغدادی پڑھا کے قرآن شریف حفظ کرانا شروع کر دیا، قوت حافظہ اچھی تھی، اور فضل ایزدی شامل حال تھا صرف

دو سال اور نو ماہ میں پورا قرآن شریف حفظ کر لیا اور چھ سال نو ماہ کی عمر میں کھڑے ہو کر تراویح سنا دی، ختم قرآن کے روز والد نے بڑا اہتمام کیا تھا اور بالائی کا حلوہ کئی من تیار کرا کے سب کو تقسیم فرمایا تھا زمانۂ حفظ قرآن میں دینیات، فقہ اور مسائل کی اردو کتابیں بھی والد نے پڑھا دی تھیں۔ بعد ختم قرآن، فارسی و عربی درسیات کے ملئے، مولوی سید رمضان علی صاحب، مولوی سید جلال شاہ صاحب ندرابی مولوی شاہ سید ابوالحسنین صاحب داناپوری مقرر کئے گئے اور بعض اسباق حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ کے متعلق کئے گئے، والد کو میری تعلیم کی تکمیل کی بڑی فکر تھی اور وہ کوئی وقت تعلیم سے خالی نہ رکھتے تھے اور اکثر خود بھی پڑھاتے تھے اور سخت نگرانی رکھتے تھے، میں بھی ان کی پوری اطاعت کرتا تھا، اور چونکہ حافظہ اور ذہن اچھا تھا برسوں کا کام مہینوں میں پورا کر لیتا تھا، مجھے فخر ہے کہ میں نے سکندر نامہ حضرت خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز مرحوم سے پڑھا تھا جو میری والدہ کے حقیقی خالو تھے اور بہت محبت اور توجہ سے گھر کے اندر بٹھا کر پڑھاتے تھے، اردوے معلیٰ غالب کا فارسی میں میں نے ترجمہ کیا تھا اور اس پر مرحوم سے اصلاح لی تھی، عربی میں جب شرح جامی اور شرح تہذیب وغیرہ ختم کر چکا تو والد مرحوم مجھکو حضرت مرشدی و استاذی مولانا محمد قیام الدین عبد الباری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت بابرکت میں لے گئے، اور فرمایا کہ اس کی تعلیم آپ کے سپرد کرتا ہوں، حضرت موصوف نے کمال شفقت و محبت مجھکو اپنے پاس بٹھا لیا اور فرمایا کہ تم مجھ سے مختصر المعانی اور قطبی پڑھا کرو، دوسرے روز سے میں انکی

خدمت میں جاکر پڑھنے لگا، تھوڑے زمانہ کے بعد حضرت نے فرنگی محل میں مدرسۂ عالیہ نظامیہ قائم کیا اور مجھکو وہاں داخل کردیا، مدرسہ میں دیگر اساتذہ کے علاوہ حضرت بھی کئی سبقوں کا درس دیتے تھے اور میری تعلیم کی نگرانی رکھتے تھے، میں مدرسہ میں کبھی فیل نہیں ہوا، اور برابر ترقی کرتا گیا، ادب سے مجھکو خاص دلچسپی تھی اور کوئی طالب علم اسمیں میری برابری نہیں کرسکتا تھا، میں نے برجستہ عربی میں تقریر کرنے کی مشق پیدا کرلی تھی اور تحریر پر بھی پوری قدرت رکھتا تھا، ایک مرتبہ دہلی سے کوئی مولوی صاحب تشریف لائے اور حضرت انکو ہمراہ لیکر مدرسہ میں آئے انہوں نے مسئلہ اجتہاد پر مجھ سے عربی میں تقریر کرنے کی فرمائش کی اور میں نے اسی وقت کھڑے ہوکر تقریر کی، جس کو انہوں نے بہت پسند کیا اور حضرت بکمال مسرور ہوئے، میں نے حماسہ، متنبی اور سبعہ معلقہ کے سیکڑوں اشعار یاد کرلئے تھے اور مقامات حریری کے سات مقامے مجھکو حفظ یاد تھے، مقامے تو بھول گیا مگر اشعار بہت سے آج تک یاد ہیں،

تفسیر و حدیث سے بھی مجھے بہت شغف تھا اور میں نے تفسیر و حدیث کی کل کتابیں حضرت سے پڑھی تھیں، بخاری شریف اور اسکے شروح کا میں اکثر مطالعہ کیا کرتا تھا اور جو احادیث نظر سے گذر جاتی تھیں وہ اکثر یاد رہتی تھیں۔ مدرسہ میں دارالمکالمہ بھی قائم تھا، اور ہر پنجشنبہ کو اس کے جلسے ہوا کرتے تھے شروع شروع میں مجھے اس سے دلچسپی نہ تھی لیکن جب اساتذہ نے سختی کی تو میں اس میں حصہ لینے گیا اور مجھے تقریر کرنے کی ایسی مہارت پیدا ہوگئی کہ میرا شمار اچھے اسپیکروں

میں ہوتا تھا،

میری انگریزی تعلیم کی ابتدا ابھی فرنگی محل ہی سے ہوئی جبکہ ماسٹر نجف علی صاحب طلبہ کو شب کے وقت میں دو گھنٹہ تعلیم دینے کیلئے ملازم رکھے گئے، تھوڑے دنوں کے بعد وہ موقوف ہو گئے اور طلبہ نے انگریزی پڑھنا چھوڑ دی مگر میں نے نہ چھوڑی اور میں شیخ احسان الرحمن صاحب قدوائی سے جو فرنگی محل میں رہتے تھے اور کیننگ کالج میں تعلیم پاتے تھے انگریزی پڑھتا رہا، جب وہ بیرسٹری پاس کرنے کے لئے ولایت چلے گئے تو میں نے شیخ شوکت علی صاحب وکیل مرحوم سے اپنی انگریزی تعلیم متعلق کی اور کئی سال تک انسے پڑھتا رہا۔

درس نظامیہ ختم کرنے اور آخری امتحان پاس کرنے کے بعد سنہ ۱۹۱۱ء میں مجھکو مدرسۂ نظامیہ سے مولانا کی سند عطا کی گئی، جسپر حضرت کے مہر اور دستخط ہیں، اس کے بعد بھی میں نے مدرسہ سے اپنا تعلق منقطع نہیں کیا بلکہ دو سال تک مدرسہ میں ادب اور منطق کے اسباق پڑھاتا رہا، سند ملنے سے تھوڑے زمانہ بیشتر ایک روز حضرت نے مجھکو بالاخانہ پر بلایا جہاں وہ تنہا بیٹھے ہوئے تھے اور مجھکو وضو کرنے کے لئے ارشاد کیا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ مجھکو حکم ہوا ہے کہ تم کو مرید کروں لہذا میں تم کو اپنے دادا صاحب کے سلسلہ میں مرید کرتا ہوں، میرے واسطے اس سے زیادہ کیا نعمت ہو سکتی تھی میں نے ہاتھ بڑھا کر بعیت سے سرفرازی حاصل کی، اسی وقت کچھ دعائیں تعلیم فرمائیں اور کچھ ہدایتیں کیں،

حضرت مرحوم مجھ سے بہت محبت فرمایا کرتے تھے اور میں بھی

انکی خدمت میں اکثر حاضر رہ کر فیض حاصل کیا کرتا تھا، اور سچ یہ ہے کہ جو کچھ مجھکو حاصل ہوا وہ بیشتر حضرت ہی کا صدقہ ہے،

مطب شروع کرنے کے کچھ زمانہ کے بعد حضرت نے مجھکو وظیفۂ حزب البحر بطریقۂ خاص تعلیم فرمایا تھا اور اس کے پڑھنے کا حکم دیا تھا جس پر میں آج تک عامل ہوں اور اس سے مجھے بیشمار فائدے پہنچتے رہے ہیں جن کا اظہار مناسب نہیں۔

مدرسہ نظامیہ میں تعلیم ختم کرنے کے بعد والد نے مجھکو طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے جناب حکیم حاجی محمد عبد العزیز صاحب مرحوم کے سپرد کیا اور انہوں نے مجھکو تکمیل الطب میں داخل فرمایا، مرحوم کے ساتھ والد کے گہرے خاندانی مراسم اور دوستانہ تعلقات تھے اور وہ مجھ پر بیحد شفقت فرماتے تھے، تکمیل الطب میں میرا تعلیمی رکارڈ بہت ممتاز رہا اور میں نے آخری امتحان اس طرح پاس کیا کہ نسخہ نویسی وغیرہ کے پرچوں میں مجھکو سو فی صدی نمبر ملے، اپریل ۱۹۱۶ء میں مجھکو تکمیل الطب سے سند عطا ہوئی، ایک سال تک شفاخانہ تکمیل الطب میں میں نے آنریری انچارج کی حیثیت سے کام کیا، میرے زمانہ میں وہاں مریضوں کی تعداد اتنی بڑھی کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی، اس عرصہ میں والد نے میرے مطب کرنے کے لئے ایک عالیشان مکان تعمیر کرایا اور جب وہ تیار ہو گیا تو میں نے وہاں بیٹھکر مطب کرنا شروع کر دیا، شفاء الملک حکیم عبد الرشید صاحب مرحوم جو میرے استاد اور جناب حکیم عبد العزیز صاحب مرحوم کے خلف اکبر تھے مجھ سے بہت محبت کرتے تھے اور مجھ کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح

سمجھتے تھے انکی عنایتیں و مہربانیاں اور انکے احسانات میں تمام عمر بھول نہیں سکتا، ان کی خوشی یہ تھی کہ میں تکمیل الطب میں پڑھایا کروں چنانچہ چھ سات برس تک میں وہاں بطور اعزازی مدرس معالجات کی تعلیم دیتا رہا اور طلبہ مجھ سے بہت خوش اور مطمئن رہے۔ ۱۹۲۰ء میں بصلۂ خدمات تعلیمی تکمیل الطب کی جانب سے مجھکو ایک تمغہ بھی دیا گیا، حصول سند کے بعد سے اس وقت تک جس کو بائیس سال گذرے مریضوں کی خدمتگزاری میں برابر مصروف رہتا ہوں، اور یہ نیت رہتی ہے کہ خداوند کریم میرے ہاتھ سے خلق اللہ کو نفع پہنچائے،

میں کسی غریب اور غیر مستطیع مریض سے کبھی فیس نہیں لیتا اور میں نے کبھی ادویہ کو ذریعۂ آمدنی نہیں بنایا، اور نہ کبھی مطب میں امرا کو غربا پر ترجیح دی، اور نہ کبھی امرا کی درباروداری یا خوشامد کی، خدا کا شکر ہے کہ میرے غریب بھائی مجھکو عزیز ہیں، اور وہ بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں اور مجھ پر بھروسہ رکھتے ہیں، میرے پاس نیکی اور بھلائی کا کوئی سرمایہ بجز اس کے نہیں ہے کہ میں اپنے آپ کو اپنے غریب بھائیوں کا ادنیٰ خادم اور ہمدرد سمجھتا ہوں اور خدا عالم الغیب ہے کہ میری ہمیشہ یہ نیت رہتی ہے کہ جس طرح ہو سکے ان کو فائدہ پہنچاؤں، مجھے کسی سے عداوت یا پرخاش کبھی نہیں رہی اور نہ میں کسی کا بدخواہ ہوا۔ میں نے کسی سے اپنی ذات کے لئے بدی کا انتقام نہیں لیا، اور نہ کسی کی ترقی یا کامیابی پر حسد کیا، مجھکو دو مرتبہ گورنمنٹ نے حکیموں کی نمائندگی کے لئے بورڈ آف انڈین مڈیسن یو۔پی کا ممبر منتخب کیا، اور میں نے چھ سال تک بلا خوف لومۃ لائم وہاں آزادی

سے کام کیا، ۱۹۲۹ء سے لکھنؤ میونسپل بورڈ کا ممبر ہوں اور دو مرتبہ مسلم پبلک نے مجھپر اعتماد کر کے مجھکو اپنا نمائندہ منتخب کیا ہے، اس سات سال کی مدت میں میں نے اپنی ناچیز بساط کے مطابق پبلک کا کام کیا ہے اور اپنے نزدیک فرائض مفوضہ کے انجام دینے میں کوتاہی نہیں کی ہے میری کوئی تالیف قابل ذکر نہیں ہے، عرصہ ہوا کہ معالجات قانون شیخ الرئیس پر میں نے بڑی محنت سے حاشیہ لکھا تھا اور اس کو طبع کرانے کا قصد تھا، افسوس کہ ایک طالب علم جو میرے پاس کبھی کبھی آیا کرتے تھے اس کو مستعار لے گئے اور پھر مجھکو واپس نہیں کیا۔

زمانۂ طالب علمی میں ایک فارسی رسالہ اصطلاحات صوفیہ لکھا تھا جس کا ذکر دیوان حافظ کے ساتھ کر چکا ہوں۔

"خطابت وتقریر" اور "عربی طب" دو چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں جو میں نے لکھکر طبع کرائے تھے اور مسلم اکاڈمی میں پیش کئے تھے،

مجھے مضمون نویسی کا کسی زمانہ میں بہت شوق تھا اور جب فرصت کا وقت تھا تو اکثر رسائل واخبارات میں میرے مضامین نکلا کرتے تھے،

میرا ایک لڑکا خواجہ سراج الدین ہے اور چار لڑکیاں ہیں، روشن آرا عرف جمیلہ، جہاں آرا عرف سلیمہ، حسن آرا، بزم آرا،

ابو الخیرات خواجہ قمر الدین احمد صاحب (خلف ثانی)

ولادت ماہ محرم ۱۳۱۸ھ مطابق مئی ۱۹۰۰ء میں ہوئی، جمادی الاول ۱۳۲۲ھ میں بعمر ۴ سال ۴ ماہ ۴ یوم تقریب مکتب نشینی ہوئی اور حضرت مولانا مولوی حاجی حافظ محمد عبدالوہاب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بسم اللہ پڑھائی، اس کے بعد حافظ حسن جان صاحب مرحوم نے قواعد بغدادی ختم کرا کے قرآن شریف حفظ کرانا شروع کیا، دوران حفظ قرآن میں اردو رسائل اور مسائل دینیات کی کتابیں بھی پڑھتے رہے تقریباً سات سال کی عمر میں شدید تپ لاحق ہوئی اور سرسام ہو گیا، جناب حکیم عبدالعزیز صاحب مرحوم معالج تھے اور بڑی توجہ سے علاج کرتے تھے بارہ روز تک سرسامی حالت رہی، اور کوئی اُمید بچنے کی باقی نہ رہی، تیرھویں روز خدا نے فضل کیا اور افاقہ ہونے لگا، سرسامی حالت تو جاتی رہی مگر تپ باقی رہی اور ورم جگر ہو گیا جس میں سال بھر تک مبتلا رہے، دس بارہ سیپارے جو حفظ کیئے تھے وہ بھی بھول گئے اور حسب مشورہ حکیم صاحب حفظ قرآن ترک کرا دیا گیا، پھر اکثر اعزا کے اصرار سے بعد ختم درسیات فارسی انکو انگریزی اسکول میں داخل کیا گیا اور انھوں نے مشن اسکول نخاس میں مڈل پاس کر لیا، اس کے بعد گورنمنٹ جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہوے اور وہاں سے انٹرنس کا امتحان (ایس۔ ایل۔ سی) پاس کیا،

اس کے بعد کرسچین کالج کے سال اول کمرشیل ڈپلوما کلاس میں داخل ہوے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں والد کو ضیق النفس کے دورے پڑنے لگے

اور ان کو مطبع کا کام انجام دینا دشوار ہوگیا، میں طبابت میں مشغول تھا مجبوراً سنہ ۱۹۲۱ء میں خواجہ قمر الدین، صاحب کو قبل تکمیل تعلیم وحصول سند کالج سے نکال کر مطبع کا منیجر مقرر کرنا پڑا اور وہ والد مرحوم کی زیر ہدایت مطبع کا کام چلانے لگے، اس وقت جنگ عظیم کے خراب اثرات سے اور نیز اس سبب سے کہ والد مرحوم کچھ زمانہ پہلے سے اپنی خرابی صحت کی بنا پر مطبع کی کافی نگرانی نہ فرما سکتے تھے مطبع کا حال قابل اطمینان نہ تھا۔

خواجہ قمر الدین صاحب نے منیجر مقرر ہوتے ہی حسابات کی جانچ شروع کی، معلوم ہوا کہ بیس پچیس ہزار روپیہ کا غبن ہوا ہے، روپیہ تو اس ملازم سے وصول نہ ہو سکتا تھا جس نے غبن کیا تھا البتہ سزا دلائی جا سکتی تھی جس کو والد نے پسند نہیں کیا، اور اس سے درگذر فرمائی۔

جو کچھ ہونا تھا ہوگیا، آئندہ کے لئے احتیاط کی گئی اور حسابات اور روپیے کی خاص نگرانی کی جانے لگی،

مطبع میں اس وقت تک قدیم طرز کے آہنی پریس چلتے تھے جو ہاتھ سے چلائے جاتے تھے، خواجہ قمر الدین سلمہ نے ولایت سے مشین منگائی، بہت سے پتھر خریدے اور جدید طرز پر مطبع کا انتظام قائم کیا، چھپائی وغیرہ کا کام جو خراب ہوگیا تھا اس کو درست کیا اور مطبع کی شہرت ونیکنامی کو بحال کرنے کی کوشش کی۔

تھوڑے روز کے بعد ایک اور مشین کا اضافہ ہوا، اور دونوں مشینیں بجلی کی قوت سے چلنے لگیں، مشینوں کے ساتھ کام بھی بڑھتا گیا، اور اس قدر عمدہ کام نکلنے لگا کہ دور دور سے کام

چھپنے کے لئے آنے لگا، غرضکہ اسی طرح مطبع کی ترقی ہوتی گئی، لیتھو کی مشینیں بھی برابر بڑھتی گئیں اور ٹائپ کی بھی مشین حاصل کرلی گئی، پریس شیڈ بھی جدید طرز کا بنوالیا گیا اور مطبع کا شمار نہ صرف لکھنؤ بلکہ یو۔ پی کے بڑے مطابع میں ہونے لگا،

خواجہ قمرالدین صاحب میں یہ وصف خدا نے دیا ہے کہ وہ بہت صبر وسکون اور استقلال وخاموشی کے ساتھ کام کرتے ہیں، انتظامی معاملات کو سمجھنے اور برتنے کی خاص قابلیت اور اہلیت رکھتے ہیں، اور ان کی طبیعت کو تجارت اور کار و بار سے لگاؤ ہے، صنعت وحرفت کے ساتھ ان کو بچپن سے دلچسپی ہے اور ان میں ایجاد واختراع کی قابلیت پائی جاتی ہے، ذکاوت وذہانت جو ان میں فطری ہے، مشکل تجارتی مسائل کے حل کرنے اور نتائج تک جلد پہنچنے میں مدد دیتی ہے، انھوں نے یہ بڑی عقلمندی کی کہ مطبع میں اصلاحات جدیدہ کو بہ تدریج نافذ کیا، ورنہ عجلت پسندی کرتے تو کام بگڑ جاتا اور مطبع بجائے ترقی کرنے کے پیچھے ہٹ جاتا، وہ صبح سویرے سے شام تک مسلسل مطبع کا کام کرتے ہیں اور ہر چیز کی بذات خود نگرانی کرتے ہیں ان کو لوگوں سے زیادہ ملنے جلنے اور کہیں آنے جانے کا شوق نہیں ہے ہاں مطبع کا کام ہو تو وہ فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔

خواجہ قمرالدین صاحب کے دل میں بھی والد مرحوم کی طرح اسلامی جوش اور قومی درد ہے اور اس کے ساتھ نمائش اور ظاہر داری سے سخت نفرت ہے،

انکا عقد ماہ صفر سنہ ۱۳۴۰ھ میں ہوا تھا، اور ان کے تین لڑکے موجود ہیں۔

خواجہ نور الدین احمد، خواجہ منیر الدین احمد، خواجہ نجم الدین احمد سلمہم اللہ وابقاہم،

تقریظ

از

صفی الدولہ ، حسام الملک ، شمس العلما ، نواب مولوی سید محمد علی حسن
خان صاحب بہادر دامت برکاتہم

تقریبًا چوبیس پچیس برس تک جناب نواب سید صدر الدین خانصاحب مرحوم ومغفور جاگیردار ریاست بڑودہ کی آمد ورفت بسلسلہ قرابت لکھنؤ مین غریب خانہ پر رہی مین نے ابتدائے روز سے دیکھا کہ وہ جب لکھنؤ آتے تو جناب حاجی الحرمین الشریفین ابو الحسنات خواجہ قطب الدین احمد صاحب مرحوم ومغفور سے ملنے کیلئے ان کے دولتکدہ پر ضرور تشریف لیجاتے اور انکو عزیزون سے بڑھکر عزیز رکھتے تھے ۔ انکے صاحبزادے بھی خواجہ صاحب کو چچا کہا کرتے تھے اور نواب صاحب موصوف اکثر خواجہ صاحب کا ذکر خیر مجھ سے کیا کرتے تھے اور کچھ ایسے دلکش انداز مین خواجہ صاحب کی خوبیان بیان کرتے کہ بے اختیار ملنے کو دل چاہنے لگتا ،

ایک روز مین نے مصمم ارادہ کرلیا کہ نواب صاحب ممدوح کی معیت مین جاکر ضرور خواجہ صاحب کی ملاقات سے مسرت حاصل کرونگا ۔ حسن اتفاق دیکھیے کہ جس دن کا یہ ذکر ہے اسی روز جناب خواجہ صاحب غریب خانہ پر تشریف لے آئے جب مین نے انکی سادہ وضع جس مین تکلف کا نام نہین ۔ خوش اخلاقی اور منکسر المزاجی دیکھی اور خصوصًا جب انکے چہرہ نورانی پر اول بار نظر پڑی تو مین نے ایک خاص کشش اپنے دل مین محسوس کی اور مین نے ان کو دیندار ۔ تقوی شعار بزرگ اور کامیاب تاجر تصور کیا ۔ اُس وقت میرا خیال اس سے آگے نہ بڑھ سکا

لیکن جناب خواجہ صاحب سے جس قدر زیادہ ملنے کا اتفاق ہوا اسی قدر جلد جلد میرے خیالات مین اضافہ ہوتا گیا اور ان کی ستودہ صفات کو مین نے اس قحط الرجال کے زمانہ مین سلف صالحین کا نمونہ پایا۔

حقیقت یہ ہے کہ جب انکی پاک باطنی۔ رقیق القلبی، صدق و دیانت راستبازی، انصاف پسندی، نوجوانون کی سی قوت عمل اور جذبۂ خدمت خلق پر غور کرتا ہون اور آج کل کے مادہ پرست زمانہ پر نظر ڈالتا ہون تو ان کی عظمت کا ایک گہرا نقش اپنے دل پر پاتا ہوں ؎

عبادت بہ از خدمت خلق نیست بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

اور بیساختہ منہ سے نکل جاتا ہے کہ۔ ؎

انچہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب

مین نے ان کی دوست نوازی کی یہ کیفیت دیکھی ہے کہ اگر کوئی دوست بیمار ہو جاتا تو اس کی تیمارداری مین اور اس کی کسی خدمت مین تامل نہ ہوتا اور عزیزون سے بڑھکر اس کی دیکھ بھال کرتے،

میرے برادر نسبتی خواجہ سید فریدالدین صاحب مرحوم جب بیمار ہوے تو مین نے خواجہ صاحب کو شب و روز ان کے علاج و معالجہ کی فکر ان کی دواسازی اور خدمت گزاری مین آخر وقت تک مشغول و منہمک پایا۔ یہی حال انکے حمیت قومی اور محبت ملی کا تھا۔ جب کوئی ادنی سے ادنی بات مسلمانون اور اسلامی حکومتون کی پست حالی اور نگوں سازی کی سن پاتے تھے تو بے اختیار تڑپ اٹھتے تھے۔ آنکھیں سرخ ہوکر ڈبڈبا آتین اور مسلسل اشک جاری ہو جاتے۔ انکا یہ رونا کوئی معمولی رونا نہ تھا بلکہ اپنے اندر ایک عجیب سوز و گداز اور بصیرتین پنہاں رکھتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے گریہ و زاری کا

میرے دل پر جو اثر ہوتا تھا وہ لفظون مین ادا نہین ہو سکتا۔
چند سال کا ذکر ہے کہ بد قسمتی سے حضرات ارا کین انتظامیہ ندوۃ العلما مین بعض ایسے اہم اختلافات پیش آ گئے تھے اور باہم کشیدگی اسقدر ترقی کر گئی تھی کہ اگر فریقین مین خلوص اور نیک نیتی نہ ہوتی تو بظاہر ندوہ کو سخت نقصان پہونچنے کا امکان تھا۔ یہ حالت ڈیڑھ دو سال تک جاری رہی آخر کار بعض مخلصین و مصلحین کے مساعی جمیلہ سے اس اختلاف کا مصالحت پر خاتمہ ہوا اور اس مصالحت کو مستحکم کرنے اور مسلمانون کو مطمئن کرنے کی غرض سے ۱۹۱۵ء مین جلسہ سالانہ ندوہ کا لکھنؤ میں قرار پایا جس میں فریقین نے کشادہ دلی اور یک جہتی کے ساتھ شرکت کی اور اطراف ہند سے متعدد اکابر قوم و ملت لکھنؤ میں اس جلسہ کی شرکت کی غرض سے تشریف فرما ہوے جلسہ کا انتظام مخصوص تجربہ کار ہمدردان ندوہ کے سپرد کیا گیا تھا۔ اسی سلسلہ میں خواجہ صاحب کو سب سے اہم خدمت یعنی کھانے کے انتظام کا کام تفویض ہوا جس کو انہون نے نہایت عرق ریزی کے ساتھ مین چار روز تک متواتر رات و دن جلسہ گاہ میں موجود رہ کر نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا مجھے یاد ہے کہ اجلاس اول کے ختم ہونے کے بعد جب مین جلسہ گاہ سے باہر آیا تو میں نے اُن کو مسلمانوں کے اجتماع اور اراکین کے اتحاد و اتفاق پر اس قدر مسرور دیکھا کہ گویا خواجہ صاحب کو غیب سے ایک بڑا دفینہ ہاتھ لگا ہے،
خدائے عزوجل نے ان محاسن و اوصاف کے ساتھ خواجہ صاحب کو ذوق علمی اور معارف نوازی کا مذاق بھی بدرجہ اتم عطا فرمایا تھا، غالباً

اسی غلبۂ ذوق اور پیروی حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بنا پر خواجہ صاحب نے وہ پیشہ اختیار کیا جس سے دین و دنیا دونوں کی فلاح وابستہ تھی اور اپنی کوشش وہمت سے نامی پریس قائم کیا اور اس کو ایسی ترقی دی کہ ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں اس کی شہرت پہونچ گئی۔ جہاں کوئی نادر الوجود کتاب انکی نظر سے گذرتی اور دستیاب ہو جاتی تو وہ اس کی اشاعت میں صرف ہمت کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے اور سرمایہ کی قلت وکثرت کو بھی بھول جاتے ایک روز کا واقعہ ہے کہ خواجہ صاحب دوپہر کے قریب غریب خانہ پر تشریف لائے انکے ہاتھ میں کتاب زہراوی کا قلمی نسخہ تھا جو فن طب کی مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس میں سرجری کے آلات کی متعدد تصویریں بھی تھیں، اس سے پیشتر میں نے کوئی کتاب سرجری کے آلات کے متعلق اس قدر جامع نہیں دیکھی تھی۔ خواجہ صاحب نے ان آلات کی تشریح اور موجودہ ترقی یافتہ سرجری کے آلات کا بالمقابل ذکر کر کے اطبا سلف کے مساعی جمیلہ پر روشنی ڈالی پھر خود بڑے اہتمام سے نامی پریس میں اس کو چھپوا کر شائع کیا۔ اور اس کا ایک نسخہ اپنے دست خاص سے مرحمت فرمایا۔ ساتھ ہی اس کے مزید مہربانی کے طور پر صد سالہ جنتری کا بھی ایک نسخہ (جس کو بڑی کاوش ومحنت سے انہوں نے تالیف کیا تھا) عنایت فرمایا۔

یہ ان معدودے چند واقعات کا ذکر ہے جو مجھ کو یاد رہ گئے ورنہ علاوہ ان کے اور بہت سے خواجہ صاحب کے میں نے ایسے عملی کارنامے بچشم خود دیکھے ہیں جو لکھنے یادرکھنے اور دل پر نقش

کرنے کے قابل تھے مگر غلبۂ نسیان ضعف پیری اور عوارض کی
وجہ سے باوجود غور وفکر کرنے کے بھی یاد نہیں آتے۔ اللہ اللہ اگلا
زمانہ بھی کیا پُر انوار زمانہ تھا کیسے کیسے مقدس لوگ تھے۔ کیسی کیسی
پاک صحبتیں تھیں۔ اب نہ وہ نورانی صورتیں نظر آتی ہیں نہ وہ بصیرت
افروز صحبتیں۔ ع خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا
چونکہ خواجہ صاحب حضرت مرشدی ومولائی عارف ربانی مولانا شاہ
فضل الرحمٰن صاحب قدس سرہ کے مرید تھے اس لئے میں خواجہ صاحب
کی متبرک ذات کو حضرت مرشدی کی ایک زندہ کرامت تصور کیا کرتا
تھا۔ یہی سبب ہے کہ جب مجھ کو خواجہ صاحب کے ارتحال پر ملال کی خبر
جانکاہ پہونچی اور میں بغرض تعزیت اپنے عزیز دلی ومحب قلبی حکیم
خواجہ شمس الدین صاحب اور خواجہ قمر الدین صاحب سلمہما اللہ تعالیٰ کے
مکان پر گیا تو میں نے حکیم صاحب موصوف کو باصرار اس طرف توجہ دلائی
کہ جناب خواجہ صاحب مرحوم ومغفور کے سوانح حیات ضرور جلد از
جلد شائع کئے جائیں اور بحکم اھل البیت ادریٰ بما فیہ آپ سب سے
زیادہ اس کام کے لئے موزوں ہیں تاکہ خواجہ صاحب کے نیازمندوں
کے تسکین دل کا سرمایہ جمع ہو اور تمام مسلمانوں کے لئے عبرت و
بصیرت کا ذریعہ ہو۔ عفر اللہ لہ۔
اس پر درد داستان کو ختم کرتے ہوے یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری
ہے کہ قدرت نے خواجہ صاحب کو طبع موزوں سخن فہمی۔ اور فکر سخن کی
نعمت سے بھی محروم رکھنا پسند نہیں کیا۔ چنانچہ کبھی کبھی اشعار پر بھی طبیعت
مائل ہو جاتی تھی اور باوجود اس کے کہ ان کو انداز رنگ تغزل سے

دور کی نسبت بھی نہ تھی پھر بھی ان کے اشعار میں بلند خیالی - ذوق طبعی اور زندہ دلی کے عناصر کافی طور پر موجود رہیں - چونکہ خواجہ صاحب اپنے اس خداداد قابلیت کو ہمیشہ اپنے اعزہ اور اولاد تک سے پوشیدہ رکھا اس لئے شاید جناب حکیم صاحب موصوف نے بھی انکے سوانح حیات میں اشعار کو جگہ نہ دی مگر میرا دل گوارا نہیں کرتا کہ ان کو یک قلم ترک کر دیا جائے اور ان کے سوانح حیات میں ایک قسم کی کمی رہ جائے اسلئے مختصراً بطور اقتباس یہاں کچھ اشعار نموتناً پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں تاکہ یہ کمی میرے ہاتھوں پوری ہو جائے اور ان کے زندگی کے اس پہلو کی خواہ وہ کتنا ہی غیر ضروری ہو ایک زندہ یادگار باقی رہ جائے -

مرے یہ اک دم نہ چین پایا وہی رہا سامنا فغاں کا
بنایا اطفال نے پپیہا پس فنا میرے استخواں کا
خوشی نہ کوئی بہار کی ہے نہ کوئی غم ہے مجھے خزاں کا
نہ گل ہوں کوئی کسی شجر کا نہ نخل ہوں کوئی بوستاں کا
جگر نہ ہوگا تو داغ کیسا جو دل نہ ہوگا تو رنج کیسا
جو ہم نہ ہونگے تو کچھ نہ ہوگا یہ سارا قصہ ہے ایک جاں کا

کوئی دم گریہ پیہم سے نہیں ہجر فرصت
یہی رونا ہے تو اے دیدۂ تر کیا ہوگا
سرد آہوں سے شگفتہ ہے یہاں غنچۂ دل
تو نہ آئیگی تو اے بادِ سحر کیا ہوگا
ستم کش ہوں میں اس ظلم آشنا کا
ترحم نام ہے جس کی جفا کا

-------- ❖ --------